

تفصیلات

نام کتاب : دین و شریعت کی بنیادیں اور فقہی اصول و ضابطے

افادات : مفسر قرآن مفتی اعظم علامہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

انتخاب و ترتیب : محمد زید مظاہری ندوی

صفحات : ۳۳۶

قیمت :

اشاعت اول : ۱۴۳۷ھ

ویب سائٹ : WWW.alislahonline.com

ملنے کے پتے

- ☆ دیوبند سہارنپور کے جملہ کتب خانے
- ☆ مدرسہ جامعہ خیر العلوم بورگاؤں خردکھنڈوہ (ایم پی)
- ☆ ندوی بک ڈپو ندوہ لکھنؤ
- ☆ مکتبہ الفرقان، نظیر آباد لکھنؤ
- ☆ مکتبہ اشرفیہ ہردوئی

أَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ

دین و شریعت کی بنیادیں

اور فقہی اصول و ضابطے

قرآن کی روشنی میں

کتاب وسنت، انبیاء و صحابہ، اجماع و قیاس، اجتہاد و تقلید، افتاء و استفتاء، کفر و اسلام، ایمان و نفاق، توحید و شرک، سنت و بدعت، قواعد شرعیہ و فقہیہ و دیگر اصولی مباحث قرآن کی روشنی میں

از افادات

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب و ترتیب

محمد زید مظاہری ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دو بگا ہردوئی روڈ لکھنؤ

اجمالی فہرست

باب (۱) کتاب اللہ کا بیان	۳۴
باب (۲) سنت رسول اللہ کا بیان	۴۶
باب (۳) اجماع امت کا بیان	۶۰
باب (۴) نبوت کا بیان	۶۵
باب (۵) اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان	۸۰
باب (۶) اجتہاد و قیاس کا بیان	۱۰۳
باب (۷) تقلید کا بیان	۱۵۱
باب (۸) اصولی مباحث و فقہی قواعد	۱۷۷
باب (۹) کفر و اسلام، ایمان و نفاق کا بیان	۲۰۱
فصل شرک کا بیان	۲۵۱
فصل بدعت کا بیان	۲۶۴
باب (۱۰) افتاء و استفتاء کا بیان	۲۷۵

☆☆☆☆☆

فہرست مضامین

صفحات	عناوین
	تقریظ حضرت مولانا مفتی عبید اللہ صاحب الاسعدی مدظلہ
	تقریظ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی
	مقدمۃ الکتاب
	باب (۱)
	کتاب اللہ سے متعلق اصولی مباحث
۳۴	قرآن کریم کی تعریف
۳۵	احکام الہیہ کی دو قسمیں تکوینی و تشریعی
۳۵	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے احکام تشریعیہ کی تین صورتیں
۳۶	احکام شرعیہ میں نسخ کی حقیقت
۳۷	احکام شرعیہ کے منسوخ ہونے کی حقیقت
	نسخ کے مفہوم میں متقدمین و متاخرین کی اصطلاح کا فرق اور
۳۹	آیات منسوخہ کی تعداد
۳۹	نسخ کے سلسلہ میں ضروری تنبیہ
۴۰	تفسیر بالرائے کرنے والے کے درس تفسیر میں شرک جائز نہیں
۴۱	قرآن حکیم اور حقائق کو نبیہ و سائنسی تحقیقات
	جدید تحقیقات کی وجہ سے قرآن میں تاویل کرنا یا قرآن حکیم کو
۴۲	اس کے تابع کرنا درست نہیں

قرآن فہمی کے لیے معمولی عربی کافی نہیں قرآن فہمی کے لیے ادب عربی سیکھنا بھی ضروری ہے	۴۳
عوام کے لیے بھی تدبر قرآن ضروری ہے	۴۴
نصیحت و عبرت کے لیے قرآن آسان ہے لیکن قرآن سے احکام کا استنباط صرف علماء مجتہدین کا حصہ ہے	۴۴
باب ۲ سنت رسول اللہ و احادیث نبویہ سے متعلق اصولی مباحث	
حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت	۴۶
حدیث کا انکار قرآن کا انکار ہے	۴۶
قرآن کی تعریف میں حدیث بھی شامل ہے	۴۸
حدیث کی تعریف	۴۹
حفاظت قرآن کے وعدے میں حدیث بھی داخل ہے	۴۹
احادیث نبویہ کو غیر محفوظ کہنا دراصل قرآن کو غیر محفوظ کہنا ہے	۵۰
قرآن کی طرح حدیث کی بھی حفاظت اور اس کی تبلیغ واجب ہے	۵۰
احادیث نبویہ کی حجیت	۵۲
احادیث نبویہ بھی کلام اللہ کے حکم میں اور واجب الاتباع ہیں	۵۲
حجیت حدیث کی پہلی دلیل	۵۲
حجیت حدیث کی دوسری دلیل	۵۲
حجیت حدیث کی تیسری دلیل	۵۴
حجیت حدیث کی چوتھی دلیل	۵۵

حجیت حدیث کی پانچویں دلیل	۵۶
آخرت کی نجات کتاب و سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے	۵۶
وحی کی دو قسمیں وحی متلو، وحی غیر متلو قرآن و حدیث کا باہمی فرق	۵۶
احادیث رسول بھی وحی الہی اور منزل من اللہ ہیں	۵۷
احکام شرعیہ کے ثبوت کے لیے قول رسول بھی کافی ہے	۵۷
حدیث رسول بھی قرآن ہی ہے	۵۸
صحابہ کرام حدیث رسول کو قرآن کا حکم سمجھتے تھے	۵۸
باب ۳ اجماع مسلمین	
اجماع کی حقیقت	۶۰
اجماع کے مختلف درجات	۶۲
اجماع کی حجیت	۶۳
اجماع مسلمین حجت شرعیہ ہے	۶۴
ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع حجت ہے	۶۴
باب ۴ نبوت کا بیان	
اللہ کا نبی انسان ہی ہو سکتا ہے	۶۵
نبی و رسول کی تعریف	۶۶
نبی کی تعریف	۶۶
نبی و رسول کا باہمی فرق	۶۷

۶۸	عصمت انبیاء
۶۹	انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا کیوں ضروری ہے؟
۶۹	انبیاء علیہم السلام گناہ صغیرہ سے بھی معصوم ہوتے ہیں
۶۹	انبیاء علیہم السلام سے بظاہر جن معاصی کا صدور ہوا ان کی حقیقت
۷۰	انبیاء علیہم السلام کی طرف عصیان کی نسبت کرنا جائز نہیں
۷۱	انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود ان کو گناہوں سے استغفار کا حکم کیوں دیا گیا؟
۷۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت و آل رسول سے بھی محبت کرنا ضروری ہے
۷۳	نبی کے حتمی فیصلہ اور امر کے بعد امتی پر اس کے مطابق عمل کرنا بہر حال واجب ہے
۷۴	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی اتباع کا حکم نبی کے بعض حقوق
۷۶	قرآن کریم کے ساتھ سنت کا اتباع بھی فرض ہے
۷۶	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف اتباع کافی نہیں محبت و عظمت بھی فرض ہے
باب ۵	
اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان	
۸۰	صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعارف قرآن کی روشنی میں
۸۱	صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف و علامات
۸۱	صحابہ کرام کی عظمت و محبت شرط ایمان ہے
۸۲	صحابہ کرام کے فضائل اور ان کے متعلق حضور ﷺ کی ہدایات

۸۳	صحابہ کرام کی ایک فضیلت
۸۴	تمام صحابہ کرام جنتی اور دوزخ سے محفوظ ہیں
۸۵	صحابی کو عذاب قبر ہو سکتا ہے یا نہیں؟
فصل	
۸۶	الصحابۃ کلہم عدول
۸۶	تمام صحابہ کی عدالت پر پوری امت کا اجماع ہے
۸۶	تمام صحابہ ثقہ، عادل، قابل اعتماد و استناد ہیں
۸۶	صحابہ کرام کی خطائیں اور ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے
۸۷	صحابہ کرام کو جانچنے و پرکھنے کا معیار قرآن و حدیث ہیں نہ کہ تاریخی روایات و واقعات
۸۷	اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ کی تکریم و تعظیم و محبت اور مدح و ثنا کرنا واجب ہے
۸۸	تمام صحابہ مغفور و مرحوم ہیں
۸۸	کسی صحابی کی طرف عیب یا برائی منسوب کرنا جائز نہیں
۸۸	صحابہ کرام کے باہمی اختلافات و نزاع کی وجہ سے کسی صحابہ پر الزام و اعتراض اور طعن و تشنیع کرنا جائز نہیں
۸۹	صحابہ کرام کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تدارک
۹۰	مشاجرات صحابہ کی وجہ سے کسی صحابی کو مطعون کرنا جائز نہیں
۹۰	صحابہ کرام کی کوتاہیوں میں بلا ضرورت غور و خوض، بحث و تحقیق کرنا بدعتی اور اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے
۹۱	دلائل و شواہد اور کتب عقائد کی تصریحات

۹۱	علمائے متکلمین و محققین کی تصریحات
۹۳	فصل مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین
۹۶	صحابہ کو برا کہنا جائز نہیں
۹۷	صحابہ کرام کے متعلق ایک ضروری ہدایت
۹۷	جنگ جمل کا مختصر واقعہ
۹۷	ام المؤمنین حضرت صدیقہ عائشہؓ کا سفر بصرہ اور جنگ جمل کے واقعہ پر روافض کے ہفوات
	باب ۶ اجتہاد و قیاس کا بیان
۱۰۳	اجتہاد اور قیاس کا ثبوت
۱۰۳	قیاس کی حقیقت
۱۰۴	قیاس کی حجیت
۱۰۴	اجتہاد فی الفروع قیامت تک باقی رہے گا
۱۰۴	مسائل جدیدہ میں اجتہاد کرنے کا وجوب
۱۰۶	حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی قیاس و استدلال کے مکلف تھے
۱۰۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کی خصوصیت
۱۰۷	اجتہاد و استنباط غلبہ ظن کا فائدہ دیتا ہے علم یقینی کا نہیں
۱۰۷	کون سا اجتہاد صحیح اور معتبر ہے
۱۰۸	اجتہاد کا محل و موقع، اجتہاد کی اجازت و گنجائش کہاں ہے
۱۰۸	کون لوگ اجتہاد کر سکتے ہیں؟

۱۰۹	اجتہاد کرنے کی اجازت ہر ایک کو نہیں
۱۱۰	اجتہاد کی اجازت اور مجتہد کے لیے اجر و ثواب کا وعدہ
	فصل اجتہادی اختلاف کا بیان
۱۱۱	مجتہدین کا اجتہادی اختلاف رحمت ہے
۱۱۲	اختلاف رائے عقل و دیانت کا تقاضا ہے
۱۱۲	ائمہ مجتہدین کا اختلاف اختلاف رحمت ہے
۱۱۴	صحابہ و تابعین میں اختلاف رائے اور اس کا درجہ
۱۱۶	ایک شبہ اور اس کا جواب
۱۱۶	یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت میں ایک چیز حلال ہو اور دوسرے امام کے نزدیک حرام ہو؟
۱۱۸	انبیاء علیہم السلام کے درمیان اجتہادی اختلاف
۱۱۹	صحابہ کے درمیان اجتہادی اختلاف
۱۱۹	اختلاف محمود اور مذموم
۱۲۰	اختلاف حق اور اختلاف رحمت کا معیار
۱۲۰	اجتہادی اختلاف کی مثال
۱۲۰	مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک جانب کو باطل سمجھنا یا اس پر نکیر کرنا درست نہیں
۱۲۲	منکر و معروف کی تعریف
۱۲۳	ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں کوئی منکر شرعی نہیں ہوتا
۱۲۴	اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود
۱۲۴	اہل علم کی سخت غلطی اور اس کا نقصان

۱۴۵	ذرا اس پہلو سے غور کریئے اور سوچیئے!
۱۴۶	ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا نہایت غلط استعمال
۱۴۸	عوام کا ایک مغالطہ اور اس کا حل
۱۴۸	ایک مثال اور لیجئے!
۱۵۰	علمائے کرام سے دردمندانہ گزارش
	باب ۷
	تقلید کا بیان
۱۵۱	حکم و اطاعت خداوندی کی چار قسمیں
۱۵۱	دوسری قسم
۱۵۲	تیسری قسم
۱۵۳	مسئلہ تقلید میں افراط و تفریط، اندھی تقلید کی ممانعت
۱۵۵	معتدل راستہ
۱۵۵	کسی کی تقلید کرنے کا شرعی معیار اور ائمہ مجتہدین کی تقلید کی حقیقت
۱۵۶	تقلید کی حقیقت اور مطلق تقلید کا وجوب
۱۵۷	علماءِ راہنہ و مجتہدین کے لیے تقلید کا حکم
۱۵۷	مجتہد فیہ مسائل کی تعریف اور ان میں تقلید کا حکم
۱۵۸	تقلید شخصی کا آغاز اور اس کا محرک
۱۵۹	تقلید شخصی ایک انتظامی ضرورت ہے
۱۶۰	تقلید شخصی کے وجوب کی دلیل اور نظیر
۱۶۱	عقلی دلیل
۱۶۱	مطلق تقلید اور تقلید شخصی کے متعلق اہم سوالوں کے جوابات

۱۴۵	دو مجتہد اگر اپنے اجتہاد سے دو متضاد فیصلے کریں تو کیا ان میں سے ہر ایک صواب اور درست ہے یا کسی ایک کو غلط کہا جائے
۱۴۷	مجتہد فیہ مسائل میں کسی مذہب کو یقینی طور سے صواب یا خطا کا فیصلہ کر دینے کا حق کسی کو نہیں
۱۴۸	دوسرے مسلک کے مقابلہ میں اپنے مسلک کی ترجیح دینے سے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا اہم ارشاد
۱۴۹	اللہ تعالیٰ کسی امام و مجتہد کو قیامت میں رسوا نہ کرے گا
۱۳۰	کسی مسلک کی ترجیح کے بجائے متفق علیہ معروفات کو پھیلانے اور منکرات کو مٹانے کی محنت کیجئے
۱۳۱	ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ (حاشیہ از مرتب)
۱۳۲	اجتہادی اختلاف سلف صالحین کی نظر میں
۱۳۲	علمی مسائل میں جھگڑا نو علم کو ضائع کر دیتا ہے
۱۳۵	اجتہادی مسائل میں اختلاف و نزاع کی اور ایک دوسرے کو خطا اور غلط کہنے کی ممانعت
۱۳۷	اجتہادی اختلافات کے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا ارشاد
۱۳۸	ائمہ مجتہدین کے اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کسی مجتہد کو مجرم اور خطاوار کہنا جائز نہیں
۱۳۸	نااہل کے اجتہاد پر نیکر کرنا واجب ہے
۱۳۹	فروعی و اجتہادی مسائل میں غلو اور اس کی وجہ سے تعصب و تحزب
۱۴۱	فروعی مسائل میں الجھنے کے بجائے باطل طاقتوں ملحدانہ فتنوں، مشرکانہ رسموں سے مقابلہ میں اپنی صلاحیت اور توانائی صرف کیجئے

۱۶۲	اجتہاد کی تعریف اور مجتہد کے شرائط
۱۶۶	تقلید شخصی کی بحث
۱۶۸	تقلید شخصی کے وجوب کی ایک واضح مثال خلافت راشدہ کے عہد میں
۱۷۱	ایک مسئلہ فقہیہ
۱۷۱	تقلید شخصی کب سے شروع ہوئی اور کیوں ہوئی؟
۱۷۳	تقلید صرف ائمہ اربعہ ہی کی کیوں کی جاتی ہے؟
۱۷۵	ائمہ اربعہ کی تقلید میں انحصار کیوں؟
۱۷۶	ہندوستان و پاکستان میں مسلک حنفی کی تخصیص
	باب (۸)
	اصولی مباحث و فقہی قواعد
۱۷۷	معصیت کا ذریعہ اور سبب بھی معصیت ہے
۱۷۷	جس امر محمود و مندوب سے فساد لازم آئے اس کا ترک ضروری ہے
۱۷۹	قاعدہ مذکورہ کے شرائط اور اس کے حدود
۱۸۰	خلاصہ اصول
۱۸۱	تنقیح اور خلاصہ
۱۸۲	سد ذرائع کا قاعدہ
۱۸۲	سد ذرائع کے قاعدہ کی تفصیل
۱۸۳	سد ذرائع کے حدود
۱۸۴	ضروری تنبیہ
۱۸۵	اعانت علی المعصیت کے حدود
۱۸۵	تسبب للمعصیۃ کے حدود

۱۸۶	سبب قریب و بعید کی تفصیل
۱۸۷	سبب قریب کا حکم
۱۸۷	سبب قریب کی دوسری قسم
۱۸۸	امام صاحب و صاحبین کا اختلاف
۱۸۸	کراہت تنزیہی و تحریمی کا مدار
	کسی جائز فعل سے اگر دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ہو تو وہ جائز
۱۸۹	فعل بھی ناجائز ہو جاتا ہے
۱۹۰	مباح اور مندوب کے ناجائز ہونے کا قاعدہ
۱۹۰	جلب منفعت و دفع مضرت کا قاعدہ
۱۹۱	مسلمانوں کے مصالح عامہ کی رعایت اور ان کو غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام
۱۹۲	اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حرمت؟
۱۹۲	محقق قول
۱۹۳	حیلہ کا بیان
۱۹۳	جائز اور ناجائز حیلہ
۱۹۴	حیلہ کے جواز کی شرط اور اس کا معیار
۱۹۵	حاجت، ضرورت اور منفعت وغیرہ کی تعریف اور ان کا حکم
۱۹۶	ضرورت و اضطرار کی تفصیل اور اس کا حکم
۱۹۷	حلال کو حرام کر لینے کی تین صورتیں اور ان کا حکم
۱۹۸	پہلی صورت کا حکم
۱۹۸	دوسری صورت کا حکم
۱۹۸	تیسری قسم کا حکم
۱۹۸	کفار فروع کے مکلف ہیں یا نہیں

باب (۹)	کفر و اسلام، ایمان و نفاق، توحید و شرک، سنت و بدعت
۲۰۱	دین و شریعت اور مذہب کا فرق
۲۰۲	نجات منحصر ہے اسلام میں
۲۰۲	غیر مسلم کے اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ بھی مقبول نہیں
۲۰۵	اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب میں نجات نہیں ہو سکتی
۲۰۶	ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو
۲۰۶	غلط فہمی کا ازالہ اور ایک شبہ کا جواب
۲۰۸	ایمان بالرسالت کے بغیر نجات نہیں
۲۱۱	ایمان کی تعریف
۲۱۳	اسلام اور ایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟
۲۱۴	ایمان اور اسلام میں فرق
۲۱۵	کفر و نفاق کی تعریف
۲۱۶	کفر و نفاق عہد نبوی کے ساتھ خاص تھا یا اب بھی موجود ہے؟
۲۱۶	ملحد و ندیق کی تعریف
۲۱۷	ایمان و کفر کی حقیقت، یہودی مؤمن کیوں نہیں؟
۲۱۸	ایمان کے صحیح اور معتبر ہونے کا معیار
۲۱۸	قادیانی مسلمان کیوں نہیں
۲۱۹	اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جائے گا، اس کا مطلب
۲۱۹	الحاد و زندقہ کی تعریف اور اس کا حکم
۲۲۰	تاویل کرنے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا، اس کی تشریح

۲۲۱	ضروریات دین کی تعریف
۲۲۲	ایمان کی تعریف
۲۲۲	کفر کی تعریف
۲۲۲	اس زمانہ میں کفر و الحاد کی گرم بازاری
۲۲۳	باطل تاویل کی دو قسمیں اور صحیح تاویل کا مصداق
۲۲۴	کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے
۲۲۴	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا بھی کفر ہے
۲۲۴	اختلافات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنانا آپ کے
۲۲۵	عہد مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں
۲۲۵	چند اہم مسائل
۲۲۶	مسلمان سمجھنے کے لیے علامات اسلام کافی ہیں باطن کی تفتیش کرنا جائز نہیں
۲۲۸	اسلام کی تحقیق کے بغیر قتل کرنا جائز نہیں
۲۲۹	اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب
۲۳۱	کسی مسلمان کو کافر یا کافر کو مسلمان کہنے میں افراط و تفریط
۲۳۲	کفر و اسلام کا معیار، چند اہم سوالوں کے جوابات
۲۳۵	ایمان و ارتداد کی تعریف
۲۳۹	قطعی الثبوت و قطعی الدلالة کی تشریح
۲۳۹	قطعیات و ضروریات دین کا فرق
۲۴۳	”اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں“ اس کی تشریح
۲۴۵	اہل قبلہ کی تعریف و تشریح
۲۴۸	تنبیہ
۲۴۹	ضابطہ تکفیر

۲۴۹	تنبیہ ضروری
	فصل
	شرک کی تعریف اور اس کے اقسام
۲۵۱	شرک کی تعریف اور اس کی چند صورتیں
۲۵۱	علم میں شریک ٹھہرانا
۲۵۱	اشراک فی التصرف
۲۵۱	عبادت میں شریک ٹھہرانا
۲۵۲	شرک اکبر کی حقیقت
۲۵۲	مخلوق کے لیے کسی علم غیب کا قائل ہونا شرک ہے؟
۲۵۳	شرک اصغر کی حقیقت
۲۵۵	دکھلاوے کے لیے پیسے خرچ کرنا بھی شرک ہے
۲۵۶	ذبح لغیر اللہ بھی شرک ہے
۲۵۶	ما اهل به لغیر اللہ، کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم
۲۶۰	اہل کتاب کی تحقیق
۲۶۰	اہل کتاب کا مصداق اور ان کے ذبیحہ کا حکم
۲۶۲	صرف نام کے یہود و نصرانی جو درحقیقت دہریے ہیں وہ اس میں داخل نہیں
۲۶۲	طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟
	فصل
	بدعت کی تعریف اور اس کی حقیقت
۲۶۴	بدعت کی تعریف اور اس کی حقیقت
۲۶۵	احداث فی الدین اور احداث للدين کی تفصیل

۲۶۶	بدعت حسنہ اور سیئہ کی حقیقت
۲۶۸	بدعت کی تعریف اور اس کے اقسام و احکام کا خلاصہ
۲۶۹	غلو فی الدین کی تعریف اور اس کی مذمت
۲۷۰	سنت اور بدعت کے حدود
۲۷۰	بدعت کی مذمت و قباحت قرآن کی روشنی میں
۲۷۰	دین میں بدعت ایجاد کرنے پر سخت وعید
	باب (۱۰)
	تحفۃ المفتی، افتاء واستفتاء کا بیان
۲۷۵	شعبۂ افتاء اور فتویٰ نویسی کی اہمیت و افادیت
۲۷۶	فقہ و فتاویٰ کا کام بہت مشکل ہے
۲۷۶	فتویٰ کی اہلیت کے لئے کسی ماہر مفتی کی تربیت ضروری ہے
۲۷۷	محض فقہ و فتویٰ کی کتابیں یاد کر لینے سے فتویٰ کی اہلیت نہیں پیدا ہوتی
۲۷۷	وہ کون سے غموض و اسرار ہیں جن کے بغیر فتویٰ کی اہلیت نامتام رہتی ہے
۲۷۸	ان باتوں کے حصول کا طریقہ
۲۷۸	حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا تحقیقی مزاج
۲۷۸	حضرت مفتی صاحب کا مطالعہ
۲۸۹	فقہی رسائل کے دیکھنے اور ان کے جمع کرنے کا اہتمام
۲۸۰	وقت کی قدر و قیمت
	فصل
	متفرق فوائد
۲۸۲	قابل تحقیق مسائل کی تحقیق کا خصوصی انتظام
	علامہ شامی کی غایت احتیاط اور بسا اوقات ان کی کتاب سے

۲۸۲	تسلی نہ ہونے کا راز	۳۰۰	تقید کرنے کا مؤثر طریقہ
۲۸۳	منہ الخالق اور فتاویٰ تنقیح الحامیہ کی خصوصیت	۳۰۱	علمی تقید کی اجازت ہے مگر طعن و تشنیع ممنوع ہے
۳۸۳	متون فقہ کی خصوصیات اور فقہی عبارات میں مفہوم مخالف معتبر ہونے کا راز	۳۰۱	ہٹ دھرمی کے وقت الزامی جواب دینا مناسب ہے
	فقہی عبارتوں کو سمجھنے اور ان کا مصداق متعین کرنے میں	۳۰۲	اگر اپنے اور دوسروں کے فتوؤں میں اختلاف ہو جائے
۲۸۴	حضرت مفتی صاحب کا طرز عمل	۳۰۲	سخت اور متعصبانہ الفاظ سے احتراز
۲۸۶	فقہ کے مشکل ابواب سے کامل مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ	۳۰۳	شیخ سے فقہی اختلاف
۲۸۶	مفتی کے لیے ایک بیاض خاص کی ضرورت اور اس کی اہمیت	۳۰۳	مد اہمت سے کلی اجتناب
	فصل	۳۰۴	حق پرستی و انصاف پسندی
	آداب فتویٰ	۳۰۵	بڑوں سے اختلاف رائے کا طریقہ
۲۸۸	فتویٰ لکھنے سے پہلے چند قابل لحاظ امور	۳۰۶	طعن و تشنیع و دل آزار اسلوب کا نقصان
۲۹۱	حالات و زمانہ کے بدل جانے سے حکم بدل جانے کی حقیقت	۳۰۷	کسی رسالہ کی تردید یا کسی فرقہ پر تقید کا طریقہ
۲۹۲	فتوے کی عبارت عام فہم ہونا چاہئے جس کو مستفتی آسانی سمجھ سکے		کسی فرد یا جماعت سے متعلق رائے قائم کرنے کے سلسلہ میں پوری تحقیق
۲۹۴	مفصل فتویٰ لکھنے کا طریقہ	۳۰۹	کے بعد بھی خوف خداوندی کا استحضار
۲۹۵	سوال کے تجزیہ و تنقیح کی ضرورت		جدید مسائل کو حل کرنے میں دوسرے علماء سے استصواب و استفسار اور
۲۹۶	غایت درجہ تحقیق و احتیاط کی ضرورت	۳۰۹	ان کی تحقیقات و آراء سے استفادہ
۲۹۶	خود رائی سے اجتناب اور بڑوں و معصروں سے مشورہ کی ضرورت		جدید مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لئے
۲۹۷	اختلاف کے باوجود ادب و احترام	۳۱۰	صاحب معاملہ اور ماہرین فن سے تحقیق کرنا
	فصل	۳۱۱	جدید مسائل کا محاکمہ قرآن و حدیث کی روشنی میں
۲۹۸	ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں	۳۱۱	تقلید شخصی شرعی حکم نہیں لیکن انتظامی اور واجبی امر ہے
۲۹۸	غیر ضروری تحقیقات اور اختلافی مسائل میں طویل بحثوں سے اجتناب		فصل
۲۹۹	بے ہودہ سوالوں کے جواب میں حلم و صبر کی ضرورت	۳۱۳	فتاویٰ میں امت کی سہولت کا خیال

۳۱۴	سہولت کی وجہ سے دوسرے مذاہب پر فتویٰ دینے کی ضرورت اور اس کے حدود و شرائط
۳۱۵	فقہی مسائل میں اجتماعی غور و فکر کی ضرورت
۳۱۷	موجودہ زمانہ میں ”مجلس فقہی مشاورت“ کی شدید ضرورت
۳۱۸	تفرد سے اجتناب اور مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام
	فصل
	مقتدا و پیشوا کے لیے ضروری ہدایات
۳۱۹	مقتدا و پیشوا کے لیے ضروری ہدایات
۳۱۹	منکرات پر نکیر کا طریقہ اور اہل علم و ارباب افتاء کے لیے اہم ہدایت
۳۲۰	تھوڑا سا وقت خلوت اور ذکر و شغل کے لیے بھی نکالنا چاہئے
۳۲۱	اہل علم و ارباب افتاء و مقتدا حضرات کو بھی ذکر و عبادت کا خاص اہتمام کرنا چاہئے
۳۲۲	اتَّقُوا مَوَاضِعَ التَّهْمِ تہمت و بدنامی کے موقعوں سے بچنا بھی ضروری ہے
۳۲۳	مسلمانوں کو غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام بھی ضروری ہے
۳۲۳	لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنا اسی وقت تک محمود ہے جب تک کسی مقصود شرعی پر اثر انداز نہ ہو
	فصل
	آداب المستفتی
۳۲۶	احکام سے ناواقف عوام الناس پر علماء و مفتیوں سے مسئلہ معلوم کر کے عمل کرنا اور ان کی تقلید کرنا واجب ہے
۳۲۷	دلائل کی حاجت نہیں

۳۲۷	بلا ضرورت سوال کرنے کی ممانعت
۳۲۷	فتویٰ لینے اور مسئلہ پوچھنے سے پہلے مستفتی کی ذمہ داری
۳۲۹	اہل علم اور مفتیوں میں اختلاف ہو تو عوام کیا کریں
	فصل
	قلم و کتابت کی اہمیت
۳۳۰	تعلیم کا سب سے پہلا اور اہم ذریعہ قلم اور کتابت ہے
۳۳۰	قلم کی تین قسمیں
۳۳۱	علم کتابت سب سے پہلے دنیا میں کس کو دیا گیا؟
۳۳۱	خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے
۳۳۲	علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ خط و کتابت کا بہت اہتمام کیا ہے
۳۳۲	خط نویسی کے چند آداب
۳۳۲	کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا
۳۳۲	خط کا جواب دینا بھی سنت انبیاء ہے
۳۳۲	خطوط میں بسم اللہ لکھنا
	ایسی تحریر جس میں کوئی آیت قرآنی لکھی ہو، کیا کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے؟
۳۳۵	خط مختصر جامع بلیغ اور مؤثر انداز میں لکھنا چاہئے
۳۳۶	بجائے صلی اللہ علیہ وسلم کے ”صلعم“، لکھنا مذموم ہے
۳۳۶	تمت

تقریظ

حضرت مولانا مفتی عبید اللہ صاحب الاسعدی مدظلہ

(استاذ حدیث و صدر مفتی جامعہ عربیہ ہتورا ضلع باندہ)

”دارالعلوم دیوبند“ ایک تعلیمی ادارے کا ہی نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کا نام تھا، اور دارالعلوم کے جن فرزندوں نے اس تحریک کی کامیابی کا ثبوت دیا اور آئندہ اس کو رواں دواں رکھا، ان میں نمایاں نام رکھنے والوں میں ”(فقیہ النفس حضرت) مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ“ کا نام بھی روشن ہے، یوں تو دارالعلوم سے کسب فیض پھر حکیم الامت سے نسبت نے تمام ہی علوم دینیہ میں ان کو نمایاں مقام عطا کیا تھا، تفسیر میں ان کے بحر کی روشن دلیل، ان کی شاہکار تفسیر ”معارف القرآن“ ہے جس نے بالخصوص ادھر چند سال کے عرصوں میں دینی مقبولیت کے ساتھ مفتی علیہ الرحمۃ کو کافی متعارف کرایا ہے، لیکن ان کا اصل فن و موضوع ”علم فقہ“ تھا فقہ سے ان کی مناسبت اور اس میں کمال و تفوق کی اس سے بڑھ کر شہادت کیا ہوگی کہ مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی کے بعد ملک کے سب سے مؤثر دارالافتاء کی صدارت آپ کو تفویض ہوئی اور اس عہد میں جو کہ اکابر کا ہی عہد تھا اور حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ جیسے فقیہ وقت بھی مفتی صاحب کے فتاویٰ پر نہ صرف اعتماد کرتے تھے بلکہ اپنی ضروریات میں رجوع بھی کرتے تھے۔

ترکی کے شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری جو کہ خود ایک بلند پایہ خفی عالم و محقق تھے انہوں نے بھی مفتی صاحب کو ”فقیہ النفس“ کا خطاب دیا ہے۔

ہمارے جامعہ کے ایک نو عمر مدرس و مفتی برادر مولوی زید صاحب کو اکابر کی تحریرات کے مطالعہ کے بعد اس کی ترتیب و تبویب سے خاص شغف ہے، اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ سے متعلق ان کی تالیفات کا سلسلہ اب محتاج تعارف نہیں رہا، دوسرے حضرات سے متعلق بھی کام کیا ہے، اور خود ہمارے حضرت (مولانا سید صدیق احمد صاحب باندویؒ) سے متعلق بھی ماشاء اللہ بہت کچھ جمع کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں مولوی موصوف نے اپنے موضوع کی مناسبت سے مفتی صاحب کی ان تحقیقات کو جمع و مرتب فرمایا ہے جو فقہاء و اہل افتاء کے لئے مشعل راہ ہیں، ان چیزوں کا یکجا ہونا ضرورت مندوں کے لئے استفادہ کو تو آسان بناتا ہی ہے، ان چیزوں سے یہ بات بھی روشن و عیاں ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اکابر سے کیا کیا کام لیا ہے اور ان حضرات کا ذوق و مزاج کیا تھا، گیرائی، نباضی، بصیرت و دقت نظر، احتیاط و تثبت کہ جس کے بعد حضرت تھانویؒ کے اس ملفوظ کو قبول نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ:

”ہمارے اکابر کی کاوشوں کو اگر عربی میں منتقل کر دیا جائے اور نام نہ ظاہر کیا جائے تو لوگ ان کو علماء متقدمین و متاخرین کی کاوش سمجھیں گے۔“

اللہ تعالیٰ مولوی موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی ان کاوشوں کو جو ہم طلبہ پر ایک عظیم علمی احسان ہے، شرف قبولیت سے نوازے۔

عبید اللہ الاسعدی غفرلہ

(استاذ حدیث و صدر مفتی جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی))

تقریظ

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی قاسمی دامت برکاتہم

المعهد الاسلامی حیدرآباد

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ماضی قریب کے ان جلیل القدر علماء میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے علمی جامعیت، فکری اعتدال اور ورع و تقویٰ سے نوازا تھا، وہ ایک ممتاز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، قدرت کی جانب سے ان کو ذکاوت طباعی اور اخذ و استنباط کی صلاحیت سے حظ وافر عطا ہوا تھا، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بافیض صحبت نے ان کی شخصیت کو اور بھی جلا بخشا۔

یوں تو انہوں نے مختلف اسلامی علوم میں اپنی خدمت کے نقوش ثبت کئے، اور تدریس و تالیف کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا لیکن جس علم میں ان کو امتیاز حاصل تھا اور جس نے ان کی شہرت کو اوج کمال تک پہنچا دیا وہ فقہ اسلامی ہے، انہوں نے نہایت دقت نظر کے ساتھ عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل پر بحث کی ہے اور ایسی معتدل رائے قائم کی ہے جن کو اہل علم کے درمیان خصوصی پذیرائی حاصل ہوئی، اگرچہ فقہ کی ایک اہم شاخ اصول فقہ پر ان کی کوئی باضابطہ اور مستقل تالیف موجود نہیں ہے لیکن معارف القرآن اور دوسری تالیفات میں اس موضوع پر بھی ڈھیر سارا مواد موجود ہے۔

ان مضامین کا انتخاب فنی ترتیب کے ساتھ ان کو مرتب کرنا اور انہیں ایک کتاب کی شکل دینا آسان کام نہیں تھا اس کے لیے گہرے علم، فقہی بصیرت اور وسیع نظر کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، محی فی اللہ، جناب مولانا مفتی محمد زید صاحب

مظاہری زیدت حسنا تم کو کہ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے، اور یقیناً اس سلسلہ میں ان کا ذوق انتخاب اور حسن ترتیب قابل تحسین ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دوسری تالیفات کی طرح اس کاوش کو بھی قبول فرمائے، اور امت کے لیے نفع کا ذریعہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

(مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی

خادم المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد

۲۷ نومبر ۲۰۱۴ء

مقدمۃ الكتاب

دین و شریعت کی بنیادیں اور فقہی اصول و ضابطے

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على سيد المرسلين،

محمد وعلى آله واصحابه اجمعين

دین اسلام جو سارے انسانوں کے لیے مکمل نظام حیات اور دستور زندگی ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قیامت تک کے لیے ہے اور امت کے ہر طبقہ کے لیے، زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس میں کامل رہنمائی موجود ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“۔ (سورہ مائدہ پ: ۳)

ترجمہ: آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا، اور میں نے اسلام کو تمہارا دین پسند کر لیا۔

نیز ارشاد فرمایا: ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“۔ (سورہ آل عمران پ: ۳)

بلاشبہ دین حق اور مقبول اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

اور ارشاد فرمایا: ”وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي

الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ“۔ (آل عمران: ۸۵)

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول

نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔ (بیان القرآن)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی واضح طور پر فرمادیا کہ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا، اب تو نجات موقوف ہے میری ہی اتباع پر اگر موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لے آئیں تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر ہی دین اسلام کی نشر و اشاعت فرمائیں گے، واضح طور پر متعدد احادیث میں آپ نے یہ باتیں بیان فرمادیں چنانچہ آپ کا فرمان ہے:

لا نبی بعدی۔ (صحیح ابن حبان حدیث: ۳۲۶۱ و ۳۸۴۶)

لا نبوة بعدی۔ (جمع الفوائد حدیث: ۷۲۰۶)

وفی رواية جابر: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فينزل عيسى بن مريم فيقول اميرهم تعال صل لنا فيقول لا إن بعضكم على بعض أمراء، وقال النبي صلى الله عليه وسلم وإمامكم منكم۔

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ ۲/۳۸۰)

وقال عليه السلام لقد جئتمكم بها بيضاء نقية ولو كان موسى حيا ما وسعه الا اتباعي۔ رواه احمد والبيهقي في شعب الایمان۔

(مشکوٰۃ شریف ۱/۳۰۰)

ولو كان (موسیٰ) حياً وأدرک نبوتی لا تبعنی۔

(رواہ الدارمی ودارقطنی ۴/۱۳۵)

احادیث مبارکہ کا حاصل وہی ہے جو ماقبل میں ذکر کیا جا چکا۔

اس جامع اور کامل مذہب میں ایسے اصول و کلیات اور اس کی ایسی مضبوط بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں قیامت تک کے آنے والے سارے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، اور کیا جا رہا ہے، پھر ان اصول و کلیات کے بھی کچھ آداب و شرائط اور اس

بنیادوں کو جو کتاب و سنت کے پختہ دلائل سے ثابت ہیں ان کا انکار کر رہا ہے، کتاب و سنت کے علاوہ اجماع و قیاس، اجتہاد و استنباط اس کے نزدیک کوئی حقیقت اور معنویت نہیں رکھتے، اور اسی بناء پر ائمہ مجتہدین کے اجتہادی کارنامے اور ان کا مدون کردہ فقہ اسلامی کا پورا ذخیرہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا حالانکہ ان سب کی حجیت اور ان کا ثبوت کتاب و سنت، قرآن و حدیث کے پختہ دلائل سے ہے۔

معمولی اردوداں اور ادنیٰ درجہ کا پڑھا لکھا شخص بلکہ ان پڑھ اور جاہل بھی بسا اوقات ایسے لوگوں کی باتوں کو سن کر اس درجہ متاثر ہو جاتا ہے کہ اس کو اسلام کی ان مضبوط بنیادوں پر بھی شکوک و شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں، اور وہ ان سب چیزوں کا انکار کر کے اپنے کو اہل قرآن و اہل حدیث ہونے پر فخر کرنے لگتا ہے۔

آج کے دور میں جب کہ ذرائع ابلاغ کی کثرت اور فراوانی ہے مختلف الحیال لوگوں کی مختلف یا متضاد باتوں کو دیکھ کر اور سن کر سیدھے سادے مسلمان بھی بیچارے بڑی الجھن و پریشانی اور بہت سے گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلام کی یہ مضبوط بنیادیں جو کتاب و سنت اجماع و قیاس وغیرہ مباحث پر مشتمل ہیں عموماً اصول کی عربی کتابوں میں تفصیل سے لکھی ہوئی ہیں، عربی نہ جاننے والے حضرات ان سے پوری طرح واقفیت کی صلاحیت نہیں رکھتے، شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اسلام کی ان مضبوط بنیادوں کو کتاب و سنت کی روشنی میں عام فہم آسان اسلوب میں مدلل طور پر مرتب کر دیا جائے تاکہ اردوداں طبقہ بھی ان بنیادوں سے اچھی طرح واقف ہو سکے اور مختلف قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رہے۔

احقر نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن کا مطالعہ کیا اس میں احقر کو اسلام کی ان مضبوط بنیادوں سے متعلق کتاب و سنت اور دلائل عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں کافی وادانی اور ثانی مواد ملا جو علمی رنگ میں مدلل ہونے کے ساتھ عام فہم بھی

کے کچھ متعلقات اور ملحقہ مباحث ہیں جن کو ہمارے علماء و فقہاء نے قرآن و حدیث کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

وہ اصول اور بنیادیں اور اس کے متعلقات کیا ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے، اسلام و ایمان، کتاب و سنت، اجماع و قیاس اور استنباط، اجتہاد و تقلید، افتاء و استفتاء، انبیاء، صحابہ۔

قرن اول سے لے کر آج تک ہمارے اسلاف فقہاء و محدثین و اصولیین ان بنیادوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کرتے آئے ہیں۔

چنانچہ اصول کی کتابوں میں مثلاً اصول بزودی، اصول السرخسی، مسلم الثبوت، الموافقات، حسامی، نور الانوار، اصول الشاشی وغیرہ کتابوں میں یہ مباحث کتاب و سنت کی روشنی میں پورے دلائل سے تحریر کئے گئے ہیں، اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے، عام طور پر یہ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔

ماضی قریب میں ایک محقق، مفسر، بزرگ فقیہ النفس گذرے ہیں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، جن کی تفسیر معارف القرآن ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیات محتاج تعارف نہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کو ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ مشکل سے مشکل علمی اور دقیق بحثوں کو بھی پختہ مضبوط دلائل کی روشنی میں ایسے آسان اسلوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اردوداں سمجھ دار پڑھا لکھا طبقہ بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

آج کے اس پر فتن دور میں جب کہ اسلام پر ہر چہا طرف سے حملے ہو رہے ہیں، اسلام کی بنیادوں کو کمزور کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، اس میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کر کے اس کو غیر معتمد قرار دیئے جانے کی بھی کوششیں جاری ہیں، اپنے آپ کو اہل قرآن و اہل حدیث کے نام سے موسوم کرنے والا فرقہ اسلام کی ان مضبوط

فتاویٰ سے تعلق رکھنے اور تخصص کرنے والوں کے لیے یہ دونوں رسالے انشاء اللہ بہت مفید اور نافع ثابت ہوں گے، اسی طرح مختلف طبقوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنے میں بھی انشاء اللہ یہ رسائل مفید ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، دین اسلام کی حفاظت کا ذریعہ بنائے، اور امت کے لیے نافع بنائے۔ آمین یا رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

محمد زید مظاہری، ندوی

استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۹ شوال ۱۴۳۵ھ

ہے اور آسان اسلوب میں بھی، اور سلیم الطبع، منصف مزاج احباب کے لیے تسلی بخش اور قابل اطمینان بھی۔

احقر نے معارف القرآن سے ایسے اصول و کلیات اور اسلام کی مضبوط بنیادوں کو چن چن کر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جس کے اہم اور مرکزی مضامین یہ ہیں: کتاب و سنت، اجماع و قیاس، اجتہاد و تقلید، افتاء و استفتاء، قواعد فقہیہ، کفر و اسلام، توحید و شرک، سنت و بدعت، انبیاء و صحابہ۔

ان موضوعات سے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل کلام اور شکوک و شبہات کے جوابات آپ کو اس رسالہ میں ملیں گے۔

مزید افادہ کے لیے موضوع سے متعلق حضرت مفتی صاحب کی دوسری تصانیف و فتاویٰ میں اگر کوئی مضمون ملا اس کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔

کتاب کا اہم باب اور اہم جز قواعد فقہیہ کے علاوہ تعریفات فقہیہ و اصطلاحات شرعیہ بھی ہیں جس میں اسلامی و فقہی اصطلاحات کی لغوی و شرعی تعریفات نقل کی گئی ہیں، جو حروف تہجی کے اعتبار سے معتد بہ مقدار میں مرتب کی گئی ہیں۔

ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے تعریفات فقہیہ و اصطلاحات شرعیہ کے حصہ کو اب علیحدہ رسالہ میں شائع کیا جا رہا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

میرادل چاہتا ہے کہ تمام علوم و فنون کی خاص اصطلاحات کو نہایت آسان کر کے اردو میں لکھ دیا جائے جس سے ایک عام آدمی بھی اصطلاحات کو سمجھنے لگے۔

(مجالس حکیم الامت دہلی: ۶۵، ملفوظ نمبر: ۴۲)

مجھے امید ہے کہ بڑی حد تک اس رسالہ سے وہ ضرورت پوری ہو سکے گی جس کا تذکرہ حضرت تھانویؒ نے کیا ہے، اردو زبان میں اپنی نوعیت کا یہ منفرد رسالہ ہے، فقہ و

باب (۱)

arau\Zukharif\Words\A0
not found.

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين
محمد وعلى آله واصحابه أجمعين، اما بعد!

کتاب اللہ سے متعلق اصولی مباحث

قرآن کریم کی تعریف

اصول فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ هو النظم والمعنى
جميعاً یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانی
قرآن کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن
کہلانے کا مستحق نہیں اگرچہ مضامین صحیح بالکل درست ہی ہوں۔ ان مضامین قرآنہ کو
بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے تو نماز ادا نہ ہوگی اسی طرح وہ تمام
احکام جو قرآن سے متعلق ہیں، اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا
جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب
نہیں ہوگا، اور اسی لیے فقہاء امت نے قرآن کریم کا ترجمہ بلا متن قرآن کے لکھنے اور
چھاپنے کو ممنوع قرار دیا ہے جس کو عرف میں اردو کا یا انگریزی کا قرآن کہہ دیا جاتا ہے۔

دین و شریعت کی بنیادیں

اور فقہی اصول و ضابطے

arau\Zukharif\Words\A0
not found.

کیونکہ درحقیقت جو قرآن اردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔۔۔۔۔ قرآن کریم کے جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام شرعیہ بھی متعلق ہیں۔

(معارف القرآن سورة البقرة ۳۲/۱)

احکام الہیہ کی دو قسمیں تکوینی و تشریعی

احکام الہی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تشریعی احکام جن میں ایک قانون بتلایا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا بتلا دی جاتی ہے، مگر کرنے والے کو کسی جانب پر مجبور محض نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو ایک درجہ کا اختیار دیا جاتا ہے، وہ اپنے اختیار سے اس قانون کی پابندی کرے یا خلاف ورزی کرے اور ایسے احکام عموماً ان مخلوقات پر عائد ہوئے ہیں جو ذوی العقول کہلاتے ہیں جیسے انسان اور جن، یہیں سے ان میں مومن و کافر اور مطیع و نافرمان کی دو قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دوسری قسم احکام کی تکوینی اور تقدیری احکام ہیں ان کی تنفیذ جبری ہوتی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ سرمو ان کے خلاف کر سکے، ان احکام کی تعمیل کل مخلوقات کرتی ہیں ان میں انسان و جن بھی شامل ہیں تکوینی احکام میں ان کے لیے جو مقدر کر دیا گیا ہے مومن ہو یا کافر متقی ہو یا فاسق سب کے سب اسی تقدیری قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہیں۔ (معارف القرآن ۷۰۳/۸)

رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے احکام تشریعیہ کی تین صورتیں

مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ. (پارہ: ۶)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام امت کو دیئے ان میں ایک تو وہ ہیں جو قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو صراحۃً مذکور نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جدا گانہ وحی کے ذریعہ نازل ہوئے۔

تیسرے وہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد و قیاس سے کوئی حکم دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی حکم نازل نہیں فرمایا وہ بھی بحکم وحی ہو گیا یہ تینوں قسم کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

اور ”مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ“ میں داخل ہیں۔

(معارف القرآن ۱۹۸/۳)

احکام شرعیہ میں نسخ کی حقیقت

نسخ کے معنی لغت میں زائل کرنے اور لکھنے کے آتے ہیں۔ دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا۔ بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے واقعات و حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلا، یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی میں نہیں ہو سکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے، اور اس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا، دوسرا حکم دینا ہوگا یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دیا اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قرارداد سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم یا ڈاکٹر، ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اس دوا کے استعمال کرنے کے

کر دیا جاتا ہے، مگر احکام الہیہ جس میں اس کا کوئی تصور و احتمال ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط ازلی اور ابدی سے کوئی چیز باہر نہیں کوئی حکم شرعی جاری ہونے کے بعد لوگوں کے کیا حالات رہیں گے، کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی، حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم ہے لیکن باقتضائے حکمت و مصلحت کوئی حکم کچھ عرصہ کے لیے جاری کیا جاتا ہے پہلے ہی سے اس کا ہمیشہ جاری رکھنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک مدت اللہ کے علم میں متعین ہوتی ہے کہ اس مدت تک یہ حکم جاری رہے گا۔ مگر اس مدت کا اظہار مخلوق پر بمصلحت نہیں کیا جاتا، الفاظ کے عموم سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم غیر موقت اور دائمی ہے، عند اللہ جو اس کی مدت مقرر ہے، جب وہ مدت ختم ہو کر حکم واپس لیا جاتا ہے تو مخلوق کی نظر میں وہ حکم کی منسوخی ہوتی ہے اور حقیقت میں وہ بیان مدت ہوتا ہے یعنی اس وقت مخلوق پر ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے یہ حکم ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ صرف اسی مدت کے لیے جاری کیا تھا اب وہ مدت ختم ہو گئی حکم باقی نہیں رہا۔

قرآن کریم میں بہت سی آیات کے منسوخ ہونے پر جو عامیانہ شبہ کیا جاتا ہے اس تقریر سے وہ شبہ رفع ہو گیا، کیا نماز تہجد خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت کے بعد بھی فرض رہی؟ بعض ائمہ تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے ان کا استدلال سورہ بنی اسرائیل کی آیت ”وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ“ سے ہے جس میں نماز تہجد کو خاص آپ کے ذمہ ایک زائد فرض کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے، کیونکہ نافلہ کے لغوی معنی زائدہ کے آتے ہیں، اور مراد فریضہ زائدہ ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ فرضیت اس نماز کی امت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے منسوخ ہو گئی، البتہ بطور استتباب اس کی ادائیگی سب کے لیے باقی رہی، اور آیت مذکورہ میں ”نافلہ لک“ اپنے اصطلاحی معنی میں بحکم نفل ہے۔ (معارف القرآن سورہ منزل ۸/۵۹۸)

بعد مریض کا حال بدلے گا اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنی ہوگی، یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن اپنی دوا تجویز کرتا ہے، جو اس دن کے مناسب ہے دودن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم یا ڈاکٹر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دے دے کہ دو روز تک یہ دوا استعمال کرو، پھر تین روز تک دوسری دوا، پھر ایک ہفتہ فلانی دوا لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے۔ اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے۔ اس لیے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات ہمیں نہیں بتلاتا، اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے ہر آنے والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے کچھلی نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، قرآن و سنت میں نسخ کے وجود وقوع کے متعلق صحابہ و تابعین کے اتنے آثار و اقوال موجود ہیں جن کو نقل کرنا مشکل ہے، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور، وغیرہ میں اسانید قویہ صحیحہ کے ساتھ بھی بہت سی روایات مذکور ہیں اور روایات ضعیفہ کا تو شمار نہیں اس لیے امت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجماعی رہا ہے، صرف ابو مسلم اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوع نسخ کا انکار کیا ہے جن پر امام رازمی نے تفسیر کبیر میں شرح و بسط کے ساتھ رد کیا ہے۔

(معارف القرآن جلد ۱، سورہ بقرہ)

احکام شرعیہ کے منسوخ ہونے کی حقیقت

دنیا کی حکومتیں یا ادارے جو اپنے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے ہیں اس کی بیشتر وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ تجربے کے بعد کوئی نئی صورت حال سامنے آتی ہے جو پہلے سے معلوم نہ تھی تو اس صورت حال کے مطابق پہلے حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری

نسخ کے مفہوم میں متقدمین و متاخرین کی اصطلاح کا فرق

اور آیات منسوخہ کی تعداد

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی تبدیل حکم کے ہیں اور یہ تبدیل جس طرح ایک حکم کو بالکل منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنادینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے اور جزوی تبدیلی، قید و شرط یا استثناء وغیرہ بھی اس میں شامل ہے، اسی لیے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا، اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطی نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ قرار دیا ہے۔ جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقا و حکم ہے نسخ خلاف اصل ہے۔ اس لیے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے اس میں ضرورت کے لیے نسخ ماننا درست نہیں۔

لیکن اس تفصیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخری انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کو ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئیں اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید تحقیق ان

پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے۔

(معارف القرآن، ص: ۲۸۵، ج: ۱، سورہ بقرہ، پ: ۱)

نسخ کے سلسلہ میں ضروری تنبیہ

نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ و تابعین اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متاخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے۔ اور نہ مخالفین کی زبان طعن اس سے بند ہو سکتی ہے، بلکہ اس زمانہ کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چودہ سو برس تک تمام علماء امت جو کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے۔ معاذ اللہ اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائے گا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل کو غلط ثابت نہ ہو جائے گی۔

(معارف القرآن، ص: ۲۸۵، ج: ۱، سورہ بقرہ، پ: ۱)

تفسیر بالرائے کرنے والے کے درس تفسیر میں

شرکت جائز نہیں

وَإِذَا رَأَيْتَ اللَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ الْحَجَّ
اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص قرآن کریم کے درس یا تفسیر میں سلف صالحین کا پابند نہیں، بلکہ ان کے خلاف معانی بیان کرتا ہے اس کے درس و تفسیر میں شرکت نص قرآن ناجائز ہے۔

(معارف القرآن، ص: ۵۸۴، پ: ۶)

قرآن حکیم اور حقائق کونیہ و سائنسی تحقیقات

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ بُرُوجًا۔ (سورہ فرقان پ ۱۹)

یہاں پر ایک بات اصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جس کا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو، مگر اس کے ساتھ ہی آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے، ان میں غور و فکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے، قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریے کی درستی سے ہو یا اس کے دینی یا دنیاوی منافع ان سے متعلق ہوں، قرآن کی دعوت صرف اسی حد تک ان چیزوں میں غور و فکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام سماویہ کی ہیشیں دریافت کرنے کا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا، اگر ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا یہ مطلب ہوتا کہ ان کے حقائق اور ہیات اور ان کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اہتمام نہ فرماتے بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے، نہ ان سے بحث کرتا اور نہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول و اسلوب کائنات اور مخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل کر سکتا ہے، اور جس کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہو سکتا

ہے۔ فلسفیانہ دور از کار بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا۔

(معارف القرآن ۶/۷۷۷-۷۷۸، پ ۱۹)

جدید تحقیقات کی وجہ سے قرآن میں تاویل کرنا یا

قرآن حکیم کو اس کے تابع کرنا درست نہیں

علماء اہل حق قدیم و جدید سب اس بات پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآن کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا۔ البتہ جن مسائل میں قرآن کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں الفاظ قرآنی میں دونوں معنی کی گنجائش ہے وہاں اگر مشاہدات اور تجربے سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیت قرآنی کو بھی اسی معنی پر محمول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ دو مفہوم میں سے ایک کی تعیین ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی آیت ”كُلُّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُحُونَ“ سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملہ میں بطلموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائے گا۔ جس کی رو سے بطلموسی ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں، وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع ان کی حرکت ہوتی ہے اس دعویٰ کی وجہ سے آیات میں کوئی تاویل نہیں کی جائے گی اور اس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا۔

(معارف القرآن ۶/۷۷۷-۷۷۸)

قرآن فہمی کے لیے معمولی عربی کافی نہیں

قرآن فہمی کے لیے ادب عربی سیکھنا بھی ضروری ہے

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت فاروق اعظم کو بھی اس لفظ (أَوْ يَأْخُذْهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ) کے معنی میں تردد پیش آیا تو آپ نے برسر منبر صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ لفظ تخوف کے آپ کیا معنی سمجھتے ہیں؟ عام مجمع خاموش رہا، مگر قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین یہ ہمارے قبیلہ کا خاص لغت ہے، ہمارے یہاں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی بتدریج گھٹانا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ کیا عرب اپنے اشعار میں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال کرتے ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں! اور اپنے قبیلہ کے شاعر ابو کبیر ہذلی کا ایک شعر پیش کیا، جس میں یہ لفظ بتدریج گھٹانے کے معنی میں لیا گیا تھا، اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: لوگو! تم اشعار جاہلیت کا علم حاصل کرو، کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معنی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ معمولی طور پر عربی زبان بولنے لکھنے کی قابلیت قرآن فہمی کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس میں اتنی مہارت اور واقفیت ضروری ہے جس سے قدیم عرب جاہلیت کے کلام کو پورا سمجھا جاسکے، کیونکہ قرآن کریم اسی زبان اور انہی کے محاورات میں نازل ہوا ہے اس درجہ کا ادب عربی سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے زمانہ جاہلیت کی عربی زبان اور اس کا لغت و محاورات سمجھنے کے لیے شعرائے جاہلیت کا پڑھنا پڑھانا جائز ہے، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ شعرائے جاہلیت کا کلام جاہلانہ رسموں اور خلاف اسلام جاہلانہ افعال و اعمال

پر مشتمل ہوگا، مگر قرآن فہمی کی ضرورت سے اس کا پڑھنا پڑھانا جائز قرار دیا گیا۔
(معارف القرآن ۵/۳۳۹ سورہ نحل پ ۱۲)

عوام کے لیے بھی تدبر قرآن ضروری ہے

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ - (نساء پ ۵)

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے لہذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لیے ہے صحیح نہیں ہے۔ البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے۔ ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا، عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا، عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی، جو کلید کامیابی ہے، البتہ عوام کے لیے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لیے یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ ہو سکے تو کوئی مستند و معتبر تفسیر کا مطالعہ کریں، اور جہاں کہیں شبہ پیش آئے تو اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں بلکہ ماہر علماء سے رجوع کریں۔
(معارف القرآن ۲/۴۸۸ سورہ نساء)

نصیحت و عبرت کے لیے قرآن آسان ہے لیکن قرآن

سے احکام کا استنباط صرف علماء مجتہدین کا حصہ ہے

”وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ“ (پ: ۲۷)

قرآن کریم نے اپنے مضامین عبرت و نصیحت کو ایسا آسان کر کے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم و ماہر فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح ہر

باب ۲

سنت رسول اللہ و احادیث نبویہ سے متعلق اصولی مباحث

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت

حدیث کا انکار قرآن کا انکار ہے

”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ“۔ (سورہ نمل پ ۱۴)

اس آیت میں ذکر سے مراد بالاتفاق قرآن کریم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیات کا بیان اور وضاحت لوگوں کے سامنے کر دیں، اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کے حقائق و معارف اور احکام کا صحیح سمجھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے، اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

علامہ شاطبیؒ نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے کیونکہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان فرمایا ہے ”إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ“۔

اور حضرت صدیقہ عائشہؓ نے اس خلق عظیم کی تفسیر فرمائی ”كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ“ اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی کوئی قول و فعل

عامی جاہل جس کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت و نصیحت کے مضامین قرآنی کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے۔

اس آیت میں يَسِّرْنَا کے ساتھ لِلذِّكْرِ کی قید لگا کر یہ بھی بتلادیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان کر دیا گیا ہے جس سے ہر عالم و جاہل چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم سے مسائل اور احکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صرف کرنے والے علماء راسخین ہی کو حصہ ملتا ہے، ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو قرآن کریم کے اس جملہ کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم اس کے اصول و قواعد سے حاصل کئے بغیر مجتہد بنا اور اپنی رائے سے احکام و مسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے۔

(معارف القرآن ۲۳۰/۸، سورہ قمر)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی کہ مضامین قرآن کو بیان نہیں کیا، یا یہ کہ آپ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا، بہرہ و صورت قرآن بحیثیت معنی کے محفوظ نہ رہا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے ”وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ اس کا یہ دعویٰ اس نص قرآنی کے خلاف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی حجت ماننے سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت قرآن ہی کا منکر ہے۔ نعوذ باللہ۔

(معارف القرآن ۵/۳۳۷)

قرآن کی تعریف میں حدیث بھی شامل ہے

”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“

(پ: ۱۳، سورہ حجر)

تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظ قرآنی کا نام ہے اور نہ صرف معانی قرآن کا بلکہ دونوں کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامین قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامین قرآنیہ ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ یا جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھ دے اس کو بھی کوئی قرآن نہیں کہے گا، اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصحف ربانی کا نام ہے، جس کے الفاظ و معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

(معارف القرآن ۵/۲۷۱)

ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں، بعض تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر و توضیح ہوتی ہیں، جن کو عام اہل علم جانتے ہیں اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے، وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے کیونکہ حسب تصریح قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عبادات، معاملات، اخلاق، عادات، سب کی سب وحی خداوندی اور بحکم قرآن ہیں۔

اور جہاں کہیں آپ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا تو بالآخر وحی الہی سے یا اس پر کوئی فکر نہ کرنے سے اس کی تصحیح اور پھر تائید کر دی جاتی ہے اس لیے وہ بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت قرآن کریم کی تفسیر و بیان کو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورہ جمعہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصد بعثت کو ذکر کیا گیا ہے، اب وہ ذخیرہ حدیث جس کو صحابہ و تابعین سے لے کر متاخرین محدثین تک امت کے باکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کر کے امت تک پہنچایا ہے اور اس کی چھان بین میں عمریں صرف کر کے روایات حدیث کے درجے قائم کر دیئے ہیں، اور جس روایت کو بحیثیت سند اس درجے کا نہیں پایا کہ اس پر احکام شرعیہ کی بنیاد رکھی جائے اس کو ذخیرہ حدیث سے الگ کر کے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں جو عمر بھر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابل اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔ (معارف القرآن ۵/۳۳۶ پ: ۱۴)

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرہ حدیث کو کسی حیلے بہانے سے ناقابل اعتماد کہتا ہے تو

حدیث کی تعریف

حفاظت قرآن کے وعدے میں حدیث بھی داخل ہے

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ قرآن صرف الفاظ قرآن کا نام نہیں ہے بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزء ہیں تو حفاظت قرآن کی ذمہ داری اس آیت میں حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ قرار دی ہے اس میں جس طرح الفاظ قرآنی کا وعدہ اور ذمہ داری ہے اسی طرح معانی و مضامین قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کے محفوظ رکھنے کی بھی ذمہ داری اللہ تعالیٰ ہی نے لی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ معانی قرآن وہی ہیں جن کی تعلیم دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے ”لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ“ یعنی آپ کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلا دیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو ان کے لیے نازل کیا گیا ہے، اور یہی معنی اس آیت کے ہیں۔ ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“۔

اور اسی لیے آپ نے فرمایا ”أَنَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لیے بھیجا گیا تو آپ نے امت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی انہیں اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔ (معارف القرآن ۲۷/۵)

احادیث نبویہ کو غیر محفوظ کہنا دراصل قرآن کو غیر محفوظ کہنا ہے

جو لوگ آج کل دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو مستند کتب میں موجود ہے وہ اس لیے قابل اعتبار نہیں کہ وہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد میں مدون کیا گیا ہے۔ اول تو ان کا یہ کہنا ہی صحیح نہیں کیونکہ حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہد رسالت میں شروع ہو چکی تھی، بعد میں اس کی تکمیل ہوئی، اس کے علاوہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت تفسیر قرآن اور معانی قرآن ہیں، ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم) ضائع ہو جائیں؟

(معارف القرآن ۲۷/۵)

قرآن کی طرح حدیث کی بھی حفاظت اور اس کی تبلیغ

واجب ہے

”وَإِذْ كُنَّا مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ“ آیات اللہ سے مراد قرآن و حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنت رسول ہے، جیسا کہ عامہ مفسرین نے حکمت کی تفسیر اس جگہ سنت سے کی ہے، اور لفظ اذکرن کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ان چیزوں کو خود یاد رکھنا جس کا نتیجہ ان پر عمل کرنا ہے، دوسرے یہ کہ جو کچھ قرآن ان کے گھروں میں ان کے سامنے نازل ہوا یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیں اس کا ذکر امت کے دوسرے لوگوں سے کریں اور ان کو پہنچائیں۔

فائدہ: ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے یہ ثابت

احادیث نبویہ کی حجیت

احادیث نبویہ بھی کلام اللہ کے حکم میں اور واجب الاتباع ہیں

حجیت حدیث کی پہلی دلیل

”مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَيْنَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ“

(سورہ مجادلہ پ ۲۸)

اس آیت میں ان درختوں کے کاٹنے جلانے یا ان کو باقی چھوڑنے، دونوں مختلف عملوں کو بِإِذْنِ اللَّهِ فرمایا ہے۔

حالانکہ قرآن کی کسی آیت میں دونوں میں سے کوئی بھی حکم مذکور نہیں۔ ظاہر تو یہ ہے کہ دونوں حضرات نے جو عمل کیا وہ اپنے اجتہاد سے کیا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی ہو، مگر قرآن نے اس اجازت کو جو کہ ایک حدیث تھی اذن اللہ قرار دے دیا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تشریع احکام کا اختیار دیا گیا ہے، اور جو حکم آپ جاری فرمائیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہی داخل ہے اس کی تعمیل قرآنی آیات کی تعمیل کی طرح فرض ہے۔

(معارف القرآن ۸/۳۶۲)

حجیت حدیث کی دوسری دلیل

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (پ: ۲۸)

ترجمہ: رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز کے لینے سے تم کو روک دیں تم رُک جایا کرو۔

الفاظ آیت عام ہیں، صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احکام بھی اس میں

ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی آیت قرآن یا حدیث سنے اس پر لازم ہے کہ وہ امت کو پہنچائے، یہاں تک کہ ازواج مطہرات پر بھی لازم کیا گیا کہ جو آیات قرآن ان کے گھروں میں نازل ہوں یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو حاصل ہوں اس کا ذکر امت کے دوسرے افراد سے کریں، اور یہ اللہ کی امانت ان کو پہنچائیں۔ (معارف القرآن ۷/۱۴۷، سورہ احزاب)

اس آیت میں جس طرح آیات قرآن کی تبلیغ و تعلیم امت پر لازم کی گئی ہے اسی طرح لفظ حکمت فرما کر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تعلیم کو بھی لازم کیا گیا ہے، اسی لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حکم کی تعمیل ہر حال میں کی ہے، صحیح بخاری میں حضرت معاذ کا یہ واقعہ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی، لیکن اس کو عام لوگوں کے سامنے اس لیے بیان نہیں کیا کہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کو اس کے درجہ میں نہ رکھیں، اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں لیکن جب ان کی وفات کا وقت آیا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ حدیث سنادی، اور فرمایا کہ میں نے اس وقت تک دینی مصلحت سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا، مگر اب موت کا وقت قریب ہے اس لیے امت کی یہ امانت ان کو پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں، صحیح بخاری میں ان کے الفاظ یہ ہیں: ”فاخبر به معاذ عند موته تأثما“، یعنی حضرت معاذ نے یہ حدیث لوگوں کو وفات کے وقت اس لیے سنادی کہ وہ گناہگار نہ ہوں کہ حدیث رسول امت کو نہیں پہنچائی۔

یہ واقعہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ اس حکم قرآنی کی تعمیل سب صحابہ کرام واجب و ضروری سمجھتے تھے، اور صحابہ کرام نے حدیث کو احتیاط کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا تھا، تو حدیث کی حفاظت بھی ایک درجہ میں قرآن کی حفاظت کے قریب قریب ہوگئی، اس معاملہ میں شبہات نکالنا درحقیقت قرآن میں شبہات نکالنا ہے۔ واللہ اعلم۔

(معارف القرآن ۷/۱۴۲، سورہ احزاب)

حجیت حدیث کی تیسری دلیل

”يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ“۔ (سورہ فتح: ۲۶)

علماء نے فرمایا کہ یہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اس کا قرآن میں کہیں صراحۃً ذکر نہیں، بلکہ یہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وحی غیر متلوٰ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر حدیبیہ میں فرمایا تھا، اسی کو اس جگہ کلام اللہ اور قال اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ احکام قرآن کے جو احکام احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں، وہ بھی حسب تصریح اس آیت کے کلام اور قول اللہ میں داخل ہیں جو محدثین احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجت دین نہیں مانتے، یہ آیتیں ان کے الحاد کو کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

ربا یہ معاملہ کہ اسی سورت میں جو سفر حدیبیہ کے شروع میں نازل ہوئی ہے یہ الفاظ قرآن میں موجود ہیں ”اَنَابَهُمْ فَتَحَّا قُريْبًا“ اور باتفاق مفسرین یہاں فتح قریب سے فتح خیبر مراد ہے، تو اس طرح قرآن میں فتح خیبر کا اور اس کے غنائم اہل حدیبیہ کو ملنے کا وعدہ آ گیا وہی اس لفظ کلام اللہ اور قال اللہ کی مراد ہو سکتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں غنیمت کا وعدہ تو ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں کہ یہ غنیمت اہل حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہوگی، دوسرے اس میں شریک نہ ہو سکیں گے یہ تخصیص تو بلاشبہ حدیث رسول ہی سے معلوم ہوئی ہے، وہی کلام اللہ اور قال اللہ کا مصداق ہے۔ اور بعض حضرات نے جو سورۃ توبہ کی آیت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے ”فَاسْتَأْذِنُوْكَ“ الخ، تو اس لیے صحیح نہیں کہ یہ آیات غزوہ تبوک کے متعلق آئی ہیں اور وہ غزوہ خیبر کے بعد

(معارف القرآن ۷/۷۷)

۹ھ میں ہوا ہے۔ (قرطبی وغیرہ)

داخل ہیں، اس لیے عام انداز میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا اور کوئی چیز آپ کسی کو عطا فرمادیں وہ اس کو لے لینا چاہئے اور اس کے مطابق عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہئے، اور جس چیز سے روک دیں اس سے رکنا چاہئے۔

بہت سے صحابہؓ نے اسی عام مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم اور واجب التعمیل قرار دیا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت میں اتسی کے بالمقابل نہی کا لفظ آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اتسی کے معنی یہاں اَمَرَ کے ہیں، جو نہی کا صحیح مقابل ہے (اھ) اور قرآن کریم نے نہی کے مقابلہ میں امر کے لفظ کو چھوڑ کر اتسی کا لفظ استعمال شاید اس لیے فرمایا کہ جس مضمون کے سیاق میں یہ آیت آئی ہے، یعنی مال فئی کی تقسیم اس پر بھی آیت کا مضمون شامل رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کو احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو حکم دیا کہ یہ کپڑے اتار دو، اس شخص نے کہا کہ آپ اس کے متعلق مجھے قرآن کی کوئی آیت بتا سکتے ہیں جس میں سلے ہوئے کپڑوں کی ممانعت ہو۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہاں وہ آیت میں بتاتا ہوں پھر یہی آیت مَا اَنَّا كُمْ الرَّسُوْلُ الخ پڑھ کر سنا دی۔

امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک محرم نے زنبور (بھڑ، تنیا) مار ڈالا تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام شافعیؒ نے یہی آیت مَا اَنَّا كُمْ الرَّسُوْلُ تلاوت کر کے حدیث سے اس کا حکم بیان فرمادیا۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ۸/۳۷۱)

حجیت حدیث کی چوتھی دلیل

”وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ“ (سورہ مائدہ پ ۶)

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں توریت و انجیل کی طرح قرآن کا مختصر نام ذکر کر دینے کے بجائے ایک طویل جملہ ”وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ“ استعمال فرمایا گیا، اس میں کیا حکمت ہے، ہو سکتا ہے کہ اس میں ان احادیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہو جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح مجھے علم و حکمت کا خزانہ قرآن کریم دیا گیا ہے، اسی طرح دوسرے علوم و معارف بھی عطا کئے گئے ہیں، جن کو ایک حیثیت سے قرآن کریم کی تشریح بھی کہا جاسکتا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

أَلَا انى اوتيت القرآن ومثله معه الا يوشك رجل شبعان على اريكته يقول عليكم بهذا القرآن، فما وجدتم فيه من حلال فاحلوه وما وجدتم فيه من حرام فحرموه، وان ما حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم كما حرم الله تعالى۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ دارمی وغیرہ)

یاد رکھو! کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اور اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے، آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم کو صرف قرآن کافی ہے جو اس میں حلال ہے صرف اس کو حلال سمجھو، اور جو اس میں حرام ہے صرف اس کو حرام سمجھو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے وہ بھی ایسے ہی حرام ہے جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں۔ (معارف القرآن ۱۹۸/۳)

حجیت حدیث کی پانچویں دلیل

آخرت کی نجات کتاب و سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے

”الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ، الْآيَةُ“ (پ ۹)

اس آیت کے شروع میں ”يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ“ فرمایا تھا، اور آخر میں ”وَابْتَغُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ“ فرمایا۔ ان میں سے پہلے جملہ میں نبی امی کے اتباع کا حکم ہے اور آخری جملہ میں قرآن کے اتباع کا، اس سے ثابت ہوا کہ نجات آخرت کتاب اور سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے، کیونکہ نبی امی کا اتباع ان کی سنت ہی کے اتباع کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ (معارف القرآن ۸۷/۴)

وحی کی دو قسمیں وحی متلو، وحی غیر متلو

قرآن و حدیث کا باہمی فرق

”وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“ (سورہ نساء پ ۵)

حکمت جو نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیمات کا یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی نازل کی ہوئی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں۔ اسی لیے داخل قرآن نہیں اور معانی اس کے اور قرآن کے دونوں اللہ کی جانب سے ہیں، اس لیے دونوں پر عمل کرنا واجب ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) متلو (جو تلاوت کی جاتی ہے)۔

(۲) اور غیر متلو (جو تلاوت نہیں کی جاتی ہے)۔

وحی متلو قرآن کا نام ہے جن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں

اس آیت میں پہلے حکم کو حکم الہی قرار دیا گیا اور پھر آسانی کے لیے منسوخ کیا گیا اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاتا ہے (بصا ص وغیرہ)۔ (معارف القرآن ۲/۳۹۸)

حدیث رسول بھی قرآن ہی ہے

”وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ“ (سورہ بقرہ پ ۲)

بصا ص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنت نبویہ ہی سے ہے تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآن نے اس کو منسوخ کر کے آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں، جو قرآن میں مذکور نہیں صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں بامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔ (معارف القرآن ۱/۳۱۹)

صحابہ کرام حدیث رسول کو قرآن کا حکم سمجھتے تھے

”إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا، الْح“ (سورہ بقرہ پ ۳)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر قرآن

اور غیر مملوحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے جن کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، اور معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ (معارف القرآن ۲/۵۴۳ و ۵۴۴)

احادیث رسول بھی وحی الہی اور منزل من اللہ ہیں

”وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ“۔ (سورہ رعد پ ۱۳)

پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلام الہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب سے مراد قرآن ہے، اور وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو، لیکن واو حرف عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ دو چیزیں الگ الگ ہوں۔ اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی ہے، کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے بلکہ ایک وحی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن کے دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں۔ (معارف القرآن ۵/۱۵۵، سورہ رعد پ ۱۳)

احکام شرعیہ کے ثبوت کے لیے قول رسول بھی کافی ہے

”أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ، الْخ“ (سورہ بقرہ پ ۲)

اس آیت سے جس حکم کو منسوخ کیا ہے یعنی سو جانے کے بعد کھانے پینے وغیرہ کی حرمت کو یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہ کرام اس حکم پر عمل کرتے تھے۔ (کما رواہ احمد فی مسندہ)

باب ۳

اجماع مسلمین

اجماع کی حقیقت

خدائے تعالیٰ کی ہزاروں ہزار درود اس ذات مقدس پر جس کے طفیل میں ہم جیسے سراپا گناہ اور سراسر خطا و قصور بھی خیر الامم، امت وسطہ، امت مرحومہ، شہدائے خلق کے القاب گرامی کے ساتھ پکارے جاتے ہیں ع

کہ داروزیر گردوں میر سامانے کہ من دارم

وہ بے شمار خداوندی انعام و اکرام جو ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ہم پر مبذول ہوئے ہیں، اجماع امت بھی ان میں سے ایک امتیازی فضیلت ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس امت کے علمائے مجتہدین اگر کسی مسئلہ میں ایک حکم پر اتفاق کر لیں تو یہ حکم بھی ایسا ہی واجب الاتباع اور واجب التعمیل ہوتا ہے جیسے قرآن و حدیث کے صریح احکام۔ جس کی حقیقت دوسرے عنوان سے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نبوت ختم کر دی گئی تو آپ کے بعد کوئی ہستی معصوم باقی نہیں رہتی جس کے حکم کو غلطی سے پاک اور ٹھیک حکم خداوندی کا ترجمان کہا جاسکے، اس لیے رحمت خداوندی نے امت محمدیہ کے مجموعہ کو ایک نبی معصوم کا درجہ دے دیا، کہ ساری امت جس چیز کے اچھے یا بُرے ہونے پر متفق ہو جائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ

کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا اور آیت سے مراد یہی آیت ہے، جس میں کتمان علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے، ایسے بعض دوسرے صحابہ نے بھی بعض روایات حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کتمان علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے۔ کیونکہ آیت میں تو کتمان کی وعید ان لوگوں کے لیے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بیانات کو چھپائے اس میں حدیث کا صراحۃً ذکر نہیں لیکن صحابہ کرام نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے اخفاء کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا۔

(معارف القرآن ج ۱: ص ۳۴۸)

کے نزدیک ایسا ہی ہے جیسا امت کے مجموعہ نے سمجھا ہے۔

اسی بات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

لَنْ تَجْمَعَ أُمَّتِي عَلَى الصَّلَاةِ۔

یعنی میری امت کا مجموعہ کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتا۔

اسی لیے اصول کی کتابوں میں اس کے حجت ہونے اور اس کے شرائط و لوازم پر مفصل بحث کی جاتی ہے، اور احکام شرعیہ کی حجتوں میں قرآن و حدیث کے بعد تیسرے نمبر پر اجماع کو رکھا جاتا ہے، اور درحقیقت اجماع کا شرعی حجتوں میں داخل ہونا اور اس امت کے لیے مخصوص ہونا خود بھی ہمارے زیر بحث مسئلہ ختم نبوت کی روشن دلیل ہے، جیسا کہ صاحب توضیح لکھتے ہیں:

وَمَا اتَّفَقَ عَلَيْهِ الْمُجْتَهِدُونَ مِنْ أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي عَصْرِ عَلَى أَمْرٍ فَهَذَا مِنْ خَوَاصِّ أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ فَإِنَّهُ خَاتِمُ النَّبِيِّينَ لَا وَحْيَ بَعْدَهُ وَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَلَا شَكَّ أَنَّ الْأَحْكَامَ الَّتِي تَثْبُتُ بِصَرْحِ الْوَحْيِ بِالنَّبِيِّ إِلَى الْحَوَادِثِ الْوَاقِعَةِ قَلِيلَةٌ غَايَةُ الْقَلِيلِ فَلَوْ لَمْ تَعْلَمْ أَحْكَامُ تِلْكَ الْحَوَادِثِ مِنَ الْوَحْيِ الصَّرِيحِ وَبَقِيَتْ أَحْكَامُهَا مُهْمَلَةً لَا يَكُونُ الدِّينُ كَامِلًا فَلَا بُدَّ أَنْ يَكُونَ لِلْمُجْتَهِدِينَ وَلَايَةٌ اسْتِبْطَاطِ أَحْكَامِهَا مِنَ الْوَحْيِ۔

(توضیح مصری ۴۹/۱)

ترجمہ: اور وہ حکم جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مجتہدین کا کسی زمانہ میں اتفاق ہو جائے اس کا واجب التعمیل ہونا اس امت کی خصوصیات میں سے ہے، کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں، اور آپ کے بعد کسی پر وحی نہیں آئے گی، اور ادھر یہ اشارہ خداوندی ہے کہ ہم نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو احکام

صریح وحی سے ثابت ہوئے ہیں، وہ بہ نسبت روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات کے نہایت قلیل ہیں، پس جب ان واقعات کے احکام وحی صریح سے معلوم نہ ہوئے (اب اگر اجماع و قیاس کو حجت نہ بنایا جائے) اور شریعت میں ان واقعات کے متعلق احکام نہ ہوں تو دین کامل نہیں رہتا، اس لیے ضروری ہے کہ اس امت کے مجتہدین کو وحی سے ان احکام کے استنباط کرنے کا حق حاصل ہو۔

الغرض جس طرح قرآن و حدیث سے احکام شرعیہ ثابت ہو رہے ہیں اسی طرح بصریح نصوص قرآن و حدیث اور باتفاق علماء امت اجماع سے قطعی احکام ثابت ہوتے ہیں۔

اجماع کے مختلف درجات

البتہ اس میں چند درجات ہیں، جن میں سب سے مقدم اور سب سے زیادہ قطعی اجماع صحابہؓ ہے، جس کے متعلق علمائے اصول کا اتفاق ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر تمام صحابہ کی رائیں بالتصریح جمع ہو جائیں تو وہ بالکل ایسا ہی قطعی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیات۔ اور اگر یہ صورت ہو کہ بعض نے اپنی رائے بیان فرمائی اور باقی صحابہ نے اس کی تردید نہ کی بلکہ سکوت اختیار کیا، تو یہ بھی اجماع صحابہ میں داخل ہے، اور اس سے جو حکم ثابت ہو وہ بالکل ایسا ہی قطعی ہے جیسے احادیث متواترہ کے احکام قطعی ہوتے ہیں۔

بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو تمام ادلہ شرعیہ میں سب سے زیادہ فیصلہ کن دلیل ہے، اور بعض حیثیات سے تمام حجج شرعیہ پر مقدم ہے، کیونکہ قرآن و سنت کے مفہوم و معنی متعین کرنے میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، اجماع میں اس کی بھی گنجائش نہیں، چنانچہ حافظ حدیث علامہ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں:

واجتماعهم حجة قاطعة يجب اتباعها بل هي اوكد الحجج وهي مقدمة على غيرها وليس هذا موضع تقرير ذلك فان هذا الأصل مقرر

قرآن کا معمول بنایا، ہر روز تین تین مرتبہ اور رات میں تین تین مرتبہ پورا قرآن ختم کرتے تھے، بالآخر یہی مذکورہ آیت ذہن میں آئی، اور اس کو علماء کے سامنے بیان کیا تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کی حجت پر یہ دلیل کافی ہے۔ (معارف القرآن ۵۴/۶۲)

اجماع مسلمین حجت شرعیہ ہے

”وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ“۔ (سورہ بقرہ پ ۳)
قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے، کیونکہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل ان کی بات کو حجت بنا دیا تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا قول تابعین پر اور تابعین کا قول تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں، وہ سب محمود و مقبول ہیں۔ کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

(معارف القرآن ۳۱۶/۱)

ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع حجت ہے

اور امام جصاص نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ پوری امت کو خطاب ہے اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانہ میں موجود تھے بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت میں ہیں، تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے جن کا قول حجت ہے وہ سب کسی خطا و غلط پر متفق نہیں ہو سکتے۔ (معارف القرآن ۳۱۷/۱)

فی موضعه وليس فيه بين الفقهاء ولا بين سائر المؤمنين الذين هم المؤمنون خلاف الخ. (اقامة الدليل ۱۳۰/۳)

433

اور اجماع صحابہ حجت قطعہ ہے اس کا اتباع فرض ہے بلکہ وہ تمام شرعی حجتوں سے زیادہ مؤکد اور سب سے مقدم ہے، یہ موقع اس بحث کے پھیلا نے کا نہیں کیونکہ اپنے موقع (یعنی کتب اصول) میں یہ بات باتفاق اہل علم ثابت ہو چکی ہے، اور اس میں تمام فقہاء اور تمام مسلمانوں میں جو واقعی مسلمان ہیں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

(رسالہ ختم نبوت، جواہر الفقہ ۲۳/۶)

اجماع کی حجیت

”وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ الْآيَةِ“ (آل عمران پ ۵)

اس آیت میں دو چیزوں کا جرم عظیم اور دخول جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے، ایک مخالفت رسول، دوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اجماع امت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن و سنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے اسی طرح امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے اور اس کی مخالفت گناہ عظیم ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: يَذُّ اللَّهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ۔
یعنی جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت مسلمین سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا۔ حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا اجماع حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید میں ہے؟

آپ نے قرآن سے دلیل معلوم کرنے کے لیے تین روز تک مسلسل تلاوت

حامل ہو، مگر ساتھ ہی اس کو ایک شان ملکیت کی بھی حاصل ہو کہ عام انسانوں اور فرشتوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کر سکے، وحی لانے والے فرشتوں سے وحی حاصل کرے اور اپنے ہم جنس انسانوں کو پہنچائے، رسول میں ایک شان ملکیت کی بھی ہوتی ہے اس کی وجہ سے جنات کو بھی مناسبت ان سے ہو سکتی ہے۔

(معارف القرآن پ: ۱۵، بنی اسرائیل ۵۳۳/۵)

نبی و رسول کی تعریف

رسول اور نبی کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، آیات مختلفہ میں غور کرنے سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں نسبت عموم و خصوص من وجہ کی ہے۔

رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعت جدیدہ پہنچائے خواہ وہ شریعت خود اس رسول کے اعتبار سے بھی جدیدہ ہو، جیسے تورات وغیرہ، یا صرف ان کی امت کے اعتبار سے جدیدہ ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم شریعت ہی تھی، لیکن قوم جرہم جن کی طرف ان کو مبعوث فرمایا تھا ان کو اس شریعت کا علم پہلے نہ تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہوا، اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد جن کو آیت قرآن ”اذا جاء المرسلون“ میں رسول کہا گیا ہے، حالانکہ وہ انبیاء نہیں تھے۔ (معارف القرآن ۶/۳۸)

نبی کی تعریف

نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو خواہ شریعت جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعت قدیمہ کی

باب ۴

نبوت کا بیان

اللہ کا نبی انسان ہی ہو سکتا ہے

عام کفار و مشرکین کا خیال تھا کہ بشر یعنی آدمی اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو ہماری طرح حوائج انسانی کا عادی ہوتا ہے پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے کہ ہم اس کو اللہ کا رسول سمجھیں اور اپنا مقتدا بنالیں، ان کے اس خیال کا جواب قرآن کریم میں کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا گیا ہے۔

یہاں آیت مَا مَنَعَ النَّاسَ (بنی اسرائیل پ ۱۵) میں جو جواب دیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول آدمی ہونا چاہئے کیونکہ غیر جنس کے ساتھ باہم مناسبت نہیں ہوتی اور بلا مناسبت کے رشد و ہدایت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اگر آدمیوں کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیں جو نہ بھوک کو جانتا ہو نہ پیاس کو، نہ جنسی خواہشات کو نہ سردی گرمی کے احساس کو، نہ کبھی محنت سے تکان لاحق ہوتا ہے تو وہ انسانوں سے بھی ایسے ہی تحمل کی توقع رکھتا ہے ان کی کمزوری و مجبوری کا احساس نہ کرتا، اسی طرح انسان جب یہ سمجھتے کہ یہ تو فرشتہ ہے ہم اس کے کاموں کی نقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تو اس کا اتباع خاک کرتے، یہ فائدہ اصلاح اور رشد و ہدایت کا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول ہو تو جنس بشر سے جو تمام انسانی جذبات اور طبعی خواہشات کا خود بھی

قسمیں اللہ کے نزدیک ہو سکتی ہیں، وہ سب آپ پر ختم ہو گئیں آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

فهذه الآية في أنه لا نبى بعده وإذا كان لا نبى بعده فلا رسول بالطريق الأولى لأن مقام الرسالة اخص من مقام النبوة فان كل رسول نبى ولا ينعكس بذلك وردت الاحاديث المتواترة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من حديث جماعة من الصحابة.

یعنی یہ آیت نص صریح ہے اس عقیدہ کے لیے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، اور جب نبی نہیں تو بدرجہ اولیٰ رسول بھی نہیں، کیونکہ لفظ نبی عام ہے اور لفظ رسول خاص ہے اور یہ عقیدہ ہے جس پر احادیث متواترہ شاہد ہیں جو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی روایت سے ہم تک پہنچی ہیں۔ (معارف القرآن ۱۶۳/۷، سورہ احزاب)

عصمت انبیاء

”مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ. الْخ“

(سورہ آل عمران پ ۳)

دنیا کی کوئی حکومت بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے۔

(۱) یہ شخص حکومت کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں؟

(۲) حکومت کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادہ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جاسکتی ہے، کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس

جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعت موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ رسول نبی سے عام ہے اور دوسرے اعتبار سے لفظ نبی بہ نسبت رسول کے عام ہے، جس جگہ یہ دونوں لفظ استعمال کئے گئے جیسا کہ آیات مذکورہ میں ”رَسُولًا نَبِيًّا“ آیا ہے، وہاں تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص و عام دونوں جمع ہو سکتے ہیں کہ تضاد نہیں۔ لیکن جس جگہ یہ دو لفظ باہم متقابل آئے ہیں، جیسے ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ“ میں تو اس جگہ بقرینہ مقام لفظ نبی کو خاص اس شخص کے معنی میں لیا جائے گا جو شریعت سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے۔ (معارف القرآن ۶۱/۳۸ - سورہ مریم ۱۹ - آیت ۵۸)

نبی و رسول کا باہمی فرق

”مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ“ (احزاب، پ ۲۲)

جمہور علماء کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو حق تعالیٰ اصلاح خلق کے لیے مخاطب فرمائیں، اور اپنی وحی سے مشرف فرمائیں، خواہ اس کے لیے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں یا پہلے ہی کسی نبی کی کتاب و شریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو، جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے۔

اور لفظ رسول خاص اس نبی کے لیے بولا جاتا ہے جس کو مستقل کتاب و شریعت دی گئی ہو، اسی طرح لفظ نبی کے مفہوم میں بہ نسبت لفظ رسول کے عموم زیادہ ہے، تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آپ انبیاء کے ختم کرنے والے اور سب سے آخر میں ہیں خواہ وہ صاحب شریعت نبی ہوں یا صرف پہلے نبی کے تابع۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی

عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اس میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوئی ہے یا خطا و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے جس کو اصلاح شریعت میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ سہو و نسیان ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال و اعمال میں ایسا سہو و نسیان ہو سکتا ہے۔ (تفسیر بحر المحیط)

مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے اسی لیے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں ہے۔ (معارف القرآن ۱۹۵/۱، سورہ بقرہ، پ: ۱)

انبیاء علیہم السلام کی طرف عصیان کی نسبت کرنا جائز نہیں

”وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ“۔ (سورہ طہ پ: ۱۶)

قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں آیت مذکورہ میں جو الفاظ عصی وغیرہ آدم علیہ السلام کے بارے میں ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے:

”لَا يَجُوزُ لِحَدَّثَنَا الْيَوْمَ أَنْ يَخْبَرَ بِذَلِكَ عَنْ آدَمَ إِلَّا إِذَا ذَكَرْنَاهُ فِي اثْنَاءِ قَوْلِهِ تَعَالَىٰ عَنْهُ أَوْ قَوْلِ نَبِيٍّ، فَمَا أَنْ يَتَدَيَّ ذَلِكُ مِنْ قَبْلِ نَفْسِهِ فَلَيْسَ بِجَائِزٍ لَنَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ الْيَوْمَ الْمَمَثَلِينَ لَنَا فَكَيْفَ فِي آبَائِنَا الْأَقْدَمِ الْأَعْظَمِ إِلَّا كَرَّمَ النَّبِيُّ الْمَقْدَمَ الَّذِي عَذَرَهُ اللَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ“

کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو، بے شک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبہ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو، لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں، اگر کسی مرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے، ورنہ علم الہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ۔ یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۹۷/۲)

انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا کیوں ضروری ہے؟

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جائے گا اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔ (معارف القرآن ۱۹۵/۱، سورہ بقرہ، پ: ۱)

انبیاء علیہم السلام گناہ صغیرہ سے بھی معصوم ہوتے ہیں

انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً و نقلًا ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ (قرطبی، معارف القرآن ۱۹۵/۱، سورہ بقرہ، پ: ۱)

انبیاء علیہم السلام سے بظاہر جن معاصی کا صدور ہوا ان کی حقیقت

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر

وَتَابَ إِلَيْهِ وَغُفِرَ لَهُ“۔ (التفسیر قرطبی، و ذکرہ فی البحر المحیط ایضاً)

ترجمہ: ہم میں سے کسی کے لیے آج یہ جائز نہیں کہ آدم علیہ السلام کی طرف یہ لفظ عصیان منسوب کرے۔ بجز اس کے کہ قرآن کی اس آیت کے یا کسی حدیث نبوی کے ضمن میں آیا ہو، وہ بیان کرے، لیکن یہ کہ اپنی طرف سے یہ لفظ ان کی طرف منسوب کرنا ہمارے اپنے قریبی آباء و اجداد کے لیے ہی جائز نہیں، پھر ہمارے سب سے پہلے باپ جو ہر حیثیت میں ہمارے آباء سے مقدم اور اعظم و اکرم ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معزز ہیں، جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا، اور معافی کا اعلان کر دیا، ان کے لیے تو کسی حال میں جائز نہیں، اسی لیے قریشی ابونصر نے فرمایا کہ اس لفظ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی اور غاوی کہنا جائز نہیں۔ اور قرآن کریم میں جہاں کہیں کسی نبی یا رسول کے بارے میں ایسے الفاظ آئے ہیں، یا تو وہ خلاف اولیٰ امور ہیں یا نبوت سے پہلے کے ہیں، اس لیے بعض آیت قرآن و روایات حدیث تو ان کا تذکرہ درست ہے لیکن اپنی طرف سے ان کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ۶/۱۳۷، سورہ طہ)

انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود ان کو گناہوں سے

استغفار کا حکم کیوں دیا گیا؟

اگر کبھی کوئی خطا سرزد ہو جائے جو آپ کی عصمت نبوت کی بنا پر درحقیقت گناہ نہیں بلکہ صرف ترک افضل ہوگا مگر آپ کی شان ارفع کے اعتبار سے صورتِ خطا ہے، اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی اس ظاہری خطا کی معافی مانگتے رہے۔

انبیاء علیہم السلام سے معصوم ہونے کے باوجود بعض اوقات اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے اور اجتہادی خطا قانون شرع میں گناہ نہیں بلکہ اس پر بھی اجر ملتا ہے مگر انبیاء

علیہم السلام کو اس خطا پر متنبہ ضرور کر دیا جاتا ہے، اور ان کی شان عالی کی وجہ سے اس کو لفظ ذنب سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے، آیت مذکورہ میں اسی طرح کا ذنب مراد ہو سکتا ہے۔ تحت قولہ تعالیٰ: فاعلم انه لا اله الا الله الخ۔ (معارف القرآن ۸/۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت و آل رسول سے

بھی محبت کرنا ضروری ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت کا ساری کائنات سے زائد ہونا جزو ایمان ہے بلکہ مدار ایمان ہے، اور اس کے لیے لازم ہے کہ جس کو جس قدر نسبت قریبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اس کی تعظیم و محبت بھی اسی پیمانے سے واجب و لازم ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کی صلبی اولاد کو سب سے زیادہ نسبت قربت حاصل ہے، اس لیے ان کی محبت بلاشبہ جزو ایمان ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ازواج مطہرات اور دوسرے صحابہ کرام جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد قسم کی نسبتیں قربت اور قربت کی حاصل ہیں ان کو فراموش کر دیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ حبِ اہل بیت و آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ امت میں کبھی زیر اختلاف نہیں رہا، باجماع و اتفاق ان کی محبت و عظمت لازم ہے۔

اختلاف وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں دوسروں کی عظمتوں پر حملہ کیا جاتا ہے ورنہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے عام سادات خواہ ان کا سلسلہ نسبت کتنا ہی بعید ہو ان کی محبت و عظمت عین سعادت و اجر ثواب ہے، یہی جمہور امت کا مسلک و مذہب ہے۔ چونکہ بہت سے لوگ اس میں کوتاہی برتنے لگے اس لیے حضرت امام شافعیؒ نے چند اشعار میں اس کی سخت مذمت فرمائی وہ اشعار یہ ہیں اور درحقیقت یہی جمہور امت کا مسلک و مذہب ہے:

يَا رَاكِبًا قَفَّ بِالْمَحْصَبِ مِنْ مَنَى
وَاهْتَفِ بِسَاكِنِ خَيْفِهَا وَالنَّاهِضِ
سَحَرًا إِذَا فَاضَ الْحَجِيجُ إِلَى مَنَى
فِيضًا كَمَلَتْ طِمَ الْفِرَاتُ الْفَائِضِ
إِنْ كَانَ رَفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ
فَلْيَشْهَدْ الثَّقَلَانِ انِّي رَافِضِي

یعنی اے شہ سوار، منی کی وادی محصب کے قریب رک جاؤ اور جب صبح کے وقت
عازمین حج کا سیلاب ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح منی کی طرف روانہ ہو، تو
اس علاقے کے ہر باشندے اور ہر راہ رو سے پکار کر یہ کہہ دو کہ اگر آل محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کی محبت ہی کا نام رخص ہے تو اس کائنات کے تمام جنات و انسان گواہ رہیں کہ میں
بھی رافضی ہوں۔

(معارف القرآن ۶۹۲/۷، سورہ شوریٰ پ ۲۵)

نبی کے حتمی فیصلہ اور امر کے بعد امتی پر اس کے مطابق عمل

کرنا بہر حال واجب ہے

”وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ. الْآيَةُ“
ترجمہ مع خلاصہ تفسیر:

اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس
کے رسول کسی کام کا گو وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو، وجوباً حکم دے دیں کہ پھر ان
مؤمنین کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ
خواہ کریں یا نہ کریں، بلکہ عمل کرنا ہی واجب ہو جاتا ہے، اور جو شخص بعد حکم وجوبی کے اللہ

کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

فائدہ: اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو
کسی کام کا حکم بطور وجوب دے دیں تو اس پر وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے، اس کو نہ
کرنے کا اختیار شرعاً نہیں رہتا اگرچہ فی نفسہ وہ کام شرعاً واجب و ضروری نہ ہو، مگر جس کو
آپ نے حکم دے دیا اس کے ذمہ لازم و واجب ہو جاتا ہے، اور جو ایسا نہ کرے آخر
آیت میں اس کو کھلی گمراہی فرمایا ہے۔

(معارف القرآن ۱۴۹/۷، احزاب پ ۲۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی اتباع کا حکم

”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ (سورہ احزاب پ ۲۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اقتداء کی تاکید ایک ضابطہ کی صورت میں
بیان فرمائی گئی ہے ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ اس سے رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سب کی اقتداء کا حکم ثابت ہوا، مگر محققین ائمہ
تفسیر کے نزدیک اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جس کام کا کرنا یا چھوڑنا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے بدرجہ وجوب ثابت ہو اس کا اتباع واجب و لازم ہے، اور جس کام کا کرنا یا
چھوڑنا بدرجہ استحباب ثابت ہو اس کا کرنا یا چھوڑنا ہم پر بھی درجہ استحباب میں رہے گا کہ
اس کی خلاف ورزی گناہ نہ قرار دی جائے گی۔

(احکام القرآن للجصاص، معارف القرآن ۱۲۱/۷)

نبی کے بعض حقوق

”فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ
أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ“ (سورہ اعراف پ ۹)

یعنی تورات و انجیل میں نبی آخر الزمان کی واضح صفات و علامات بتلا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ آپ پر ایمان لائیں، اور آپ کی تعظیم کریں اور مدد کریں، اور اس نور کا اتباع کریں جو آپ کے ساتھ بھیجا گیا ہے، یعنی قرآن عظیم تو یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔

یہاں فلاح پانے کے لیے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں، اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان دوسرے آپ کی تعظیم و تکریم، تیسرے آپ کی امداد، چوتھے قرآن کریم کا اتباع۔

تعظیم و تکریم کے لیے اس جگہ لفظ عَزَّوْهُ لایا گیا ہے جو تعزیر سے مشتق ہے، تعزیر کے اصلی معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عَزَّوْهُ کے معنی تعظیم و تکریم کرنے کے بتلائے ہیں، اور مبرّد نے کہا کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کے ساتھ آپ کی تائید و حمایت اور مخالفین کے مقابلہ میں آپ کی مدد کریں وہ مکمل فلاح پانے والے ہیں، زمانہ نبوت میں تو یہ تائید و نصرت آپ کی ذات کے ساتھ متعلق تھی اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی شریعت اور آپ کے دین کی تائید و نصرت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کا مصداق ہے۔

قرآن کریم کو اس آیت میں نور سے تعبیر کیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ جس طرح نور کے نور ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، نور خود اپنے وجود کی دلیل ہوتا ہے، اسی طرح قرآن کریم خود اپنے کلام ربانی اور کلام حق ہونے کی دلیل ہے کہ ایک امی شخص کی زبان سے ایسا اعلیٰ و بلغ کلام آیا جس کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہوگئی، یہ خود قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

نیز جس طرح نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسری اندھیریوں میں بھی اجالا کر دیتا ہے اسی طرح قرآن کریم نے اندھیریوں میں پھنسی ہوئی دنیا کو تاریکیوں سے نکالا۔

قرآن کریم کے ساتھ سنت کا اتباع بھی فرض ہے

اس آیت کے شروع میں ”يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ“ فرمایا تھا اور آخر میں ”وَاتَّبِعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ“ فرمایا۔

ان میں سے پہلے جملہ میں نبی امی کے اتباع کا حکم ہے اور آخری جملہ میں قرآن کے اتباع کا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نجات آخرت کتاب اور سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے کیونکہ نبی امی کا اتباع ان کی سنت ہی کے اتباع کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف اتباع کافی نہیں

محبت و عظمت بھی فرض ہے

اور ان دونوں جملوں کے درمیان ”عَزَّوْهُ وَنَصْرُوْهُ“ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے عام دنیا کے احکام کا اتباع جبراً قہراً کرنا پڑتا ہے، بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت و محبت کا نتیجہ ہو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو، کیونکہ امت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ امیر و حاکم ہے اور امت محکوم و رعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری امت ان کی محب۔

ایک یہ کہ رسول اپنے کمالات علمی، عملی، اخلاقی کی بنا پر صاحب عظمت ہے اور

ایک آیت قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں، اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں ”لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا“ آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال جبط اور برباد ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت ہر حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام و تعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیت مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے، یہی حال حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا۔ (شفاء)

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپ کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا، اور اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لیے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

ترمذی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ مجلس صحابہؓ میں جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے، صرف صدیق اکبر اور فاروق اعظمؓ آپ کی طرف نظر کرتے اور آپ ان کی طرف نظر فرما کر تبسم فرماتے تھے۔

عروہ بن مسعود کو اہل مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لیے مدینہ بھیجا، اس نے صحابہ کرام کو پروانہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گرتا اور فدا ہوتا ہوا دیکھ کر واپسی میں یہ رپورٹ دی کہ میں نے کسریٰ و قیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں اور

ساری امت ان کے مقابلہ میں پست اور عاجز۔

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجہ کمال میں پائی جاتی ہیں اس لیے امت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں، بحیثیت امیر و حاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں، اور بحیثیت کمالات نبوت ان کی تعظیم و تکریم بجالائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہئے تھا، کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کو بھی لازم قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے آداب سکھائے گئے ہیں۔

اس آیت میں تو ”عَزَّوْهُ وَنَصْرُوْهُ“ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی ”وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُقْوُّوْهُ“ آیا ہے اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپ کی آواز سے بڑھ جائے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ“۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْلَبُ وَجْهَكُمْ إِلَى يَدَيْ اللَّهِ وَرِئُوسُكُمُ“ یعنی اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو، یعنی جس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں اور کوئی معاملہ پیش آئے تو آپ سے پہلے کوئی نہ بولے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ نے اس آیت کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ آپ سے پہلے نہ بولیں، اور جب آپ کلام کریں تو سب خاموش ہو کر سنیں۔

باب ۵

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعارف قرآن کی روشنی میں

”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ اَشْهَدُوْا“ الخ۔ (پ ۲۶، سورہ فتح)

اس مقام پر حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بیان فرما کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف و فضائل اور خاص علامات کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرمایا ہے۔ اس میں ان کے سخت امتحان کا انعام بھی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت لیا گیا تھا کہ ان کے قلبی یقین اور قلبی جذبات کے خلاف صلح ہو کر بغیر دخول مکہ وغیرہ کے ناکام واپسی کے باوجود ان کے قدم منزل نہیں ہوئے، اور بے نظیر اطاعت رسول اور قوت ایمانی کا ثبوت دیا۔ نیز صحابہ کرام کے فضائل اور علامات کی تفصیل بیان فرمانے میں یہ حکمت بھی ہو تو بعید نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی و رسول تو مبعوث ہونے والا نہیں تھا، آپ نے اپنے بعد امت کے لیے کتاب اللہ کے ساتھ اپنے اصحاب کو بطور نمونہ کے چھوڑا ہے اور ان کی اقتداء و اتباع کے احکام دیئے ہیں، اس لیے قرآن نے بھی ان کے کچھ فضائل اور علامات کا بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کے اتباع کی ترغیب و تاکید فرمادی ہے۔

(معارف القرآن ۹۲/۸)

ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں، مگر جو حال میں نے اصحاب محمدؐ کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہو گے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے، تو صحابہ کرامؓ باہر سے آواز دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانا بے ادبی سمجھتے تھے دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ و تابعینؓ کا معمول یہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو درکنار کوئی وعظ تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے، اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہو گئے۔

اسی تعظیم و توقیر کی برکت تھی کہ ان حضرات کو کمالات نبوت سے خاص حصہ ملا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے بعد سب سے اونچا مقام عطا فرمایا۔

(معارف القرآن، سورہ اعراف پ ۹، ص ۸۶ تا ۸۹ جلد ۴)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف و علامات

صحابہ کرام کا سب سے پہلا وصف تو یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں، کفار کے مقابلہ میں سخت ہونا ان کا ہر موقع پر ثابت ہوتا رہا ہے کہ نسبتی رشتے ناتے سب اسلام پر قربان کر دیئے اور آپس میں مہربان اور ایثار پیشہ ہونا صحابہ کرام کا اس وقت خصوصیت سے ظاہر ہوا، جب کہ مہاجرین و انصار میں مواخات ہوئی اور انصار نے اپنی سب چیزوں میں مہاجرین کو شرکت کرنے کی دعوت دی۔

دوسرا وصف صحابہ کرام کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کا عام حال یہ ہے کہ وہ رکوع و سجدہ اور نماز میں رہتے ہیں، ان کو دیکھنے والے اکثر ان کو اسی کام میں مشغول پاتے ہیں۔ نماز ان کا ایسا وظیفہ زندگی بن گیا ہے کہ نماز اور سجدہ کے مخصوص آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ (معارف القرآن ۹۳/۸)

سب (صحابہ کرام) کے دلوں میں ایمان رچا بسا ہوا تھا ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت و عظمت کا ایسا غلبہ تھا جس میں کوئی رشتہ ناطہ برادری اور قومیت حائل نہ ہوئی۔ ان کی محبت و عظمت کا اصل تعلق صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے تھا، جب اپنے باپ سے ان کے خلاف بات سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خود اپنے باپ کا سر قلم کرنے کی پیش کش کر دی۔

بدراور احداور احزاب کی جنگوں نے تو بذریعہ تلوار اس قوم پرستی اور وطن پرستی کے بت کے ٹکڑے اڑائے ہیں، جس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی قوم و وطن اور کسی رنگ و زبان کا ہو وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور جو اللہ و رسول کو نہ مانے وہ اگرچہ حقیقی بھائی اور باپ ہی کیوں نہ ہو، وہ دشمن ہے۔ (معارف القرآن ۲۵۶/۸، ۲۵۵)

صحابہ کرام کی عظمت و محبت شرط ایمان ہے

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ

(سورہ حشر ۲۸)

اس مقام میں حق تعالیٰ نے پوری امت محمدیہ کے تین طبقے کئے ہیں۔ مہاجرین، انصار، اور باقی تمام امت، مہاجرین و انصار کے خاص اوصاف اور فضائل بھی اس جگہ ذکر فرمائے مگر باقی امت کے فضائل اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز یہ بتلائی کہ وہ صحابہ کرام کی سبقت ایمانی اور ایمان کے ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے کو پہنچائیں، اور سب کے لیے دعاء مغفرت کریں اور اپنے لیے یہ دعا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی مسلمان سے کینہ و نفرت نہ رہے اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے بعد والے جتنے مسلمان ہیں ان کا ایمان و اسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ صحابہ کرام کی عظمت و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں اور ان کے لیے دعا کرتے ہوں جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں۔ اسی لیے حضرت مصعب بن سعدؓ نے فرمایا کہ امت کے تمام مسلمان تین درجوں میں ہیں جن میں دو درجے تو گزر چکے، یعنی مہاجرین و انصار، اب صرف ایک درجہ باقی رہ گیا یعنی وہ جو صحابہ کرام سے محبت رکھے، ان کی عظمت پہنچانے اب اگر تمہیں امت میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجہ میں داخل ہو جاؤ۔

قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کی محبت ہم پر واجب ہے۔

(معارف القرآن ۳۸۱/۸)

صحابہ کرام کے فضائل اور ان کے متعلق حضور ﷺ کی ہدایات

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم“۔ (بخاری)

یعنی تمام زمانوں میں میرا زمانہ بہتر ہے اس کے بعد اس زمانے کے لوگ بہتر ہیں، جو میرے زمانہ کے متصل ہیں، پھر وہ جو ان کے متصل ہیں۔

قدرتی انتظام ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۸/۸۶)

تمام صحابہ کرام جنتی اور دوزخ سے محفوظ ہیں

(۱) محمد بن کعب قرطبی سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، انہوں نے کہا صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں اگرچہ وہ لوگ ہوں جن سے دنیا میں غلطیاں اور گناہ بھی ہوئے ہیں اس شخص نے دریافت کیا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی (اس کی دلیل کیا ہے؟) انہوں نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھو، ”وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَدَّمُونَ إِلَى اللَّهِ بِحَسَنَاتِهِمْ فِي هَؤُلَاءِ السَّعَاتِ أُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَأُولَئِكَ فِيهَا مُقَدَّمُونَ“ (اس میں تمام صحابہ کرام کے متعلق بلا کسی شرط کے رضی اللہ عنہم ورضوانہ ارشاد فرمایا ہے البتہ تابعین کے معاملہ میں اتباع باحسان کی شرط لگائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید و شرط کے سب کے سب بلا استثناء رضوان الہی سے سرفراز ہیں۔

(۲) تفسیر مظہری میں یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک سب صحابہ کرام کے جنتی ہونے پر اس سے بھی زیادہ واضح استدلال اس آیت سے ہے: ”لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى“۔ (پ: ۲۷)

اس آیت میں پوری صراحت سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام اولین ہوں یا آخرین سب سے اللہ تعالیٰ نے حسنی یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ (معارف القرآن ۴/۴۵۰)

(۳) حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اس مسلمان کو نہیں چھو سکتی جس نے مجھے دیکھا ہے یا میرے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے۔

(معارف القرآن: ۴۵۰، ج: ۴، پ: ۱۱)

(۴) ”لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى“۔ (پ: ۲۷)

(۲) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کو برا نہ کہو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو وہ ان کے خرچ کئے ہوئے کے ایک مد (آدھا سیر) کے برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ نصف مد کے برابر۔ (بخاری شریف)

(۳) حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ کو سارے جہاں میں پسند فرمایا پھر میرے صحابہ میں چار کو پسند فرمایا ہے، ابو بکر، عمر، عثمان، علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ (بزار مسند صحیح)

(۴) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ”اللَّهُ اللَّهُ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَخَذُوهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِي“ (جمع الفوائد) اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، میرے صحابہ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ مت بناؤ، کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کے ساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی، اور جو اللہ کو ایذا پہنچانے کا قصد کرے قریب ہے کہ اللہ اس کو عذاب میں پکڑے گا۔ (معارف القرآن ۸/۹۶ پ: ۲۶)

صحابہ کرام کی ایک فضیلت

”فَتَصِيبُكُمْ مِنْهُمْ مَعْرَةٌ بَغَيْرِ عِلْمٍ“ (پ: ۲۶)

امام قرطبی نے فرمایا کہ بغیر علم کے اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے وہ گناہ تو نہیں مگر ایک عیب اور عار اور ندامت و افسوس کا سبب ضرور ہے۔

اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں مگر عامۃ ان کو خطاؤں اور عیبوں سے بچانے کا

فصل

الصحابہ کلہم عدول

تمام صحابہ کی عدالت پر پوری امت کا اجماع ہے

تمام صحابہ ثقہ، عادل، قابل اعتماد و استناد ہیں

آیات و احادیث اس کے متعلق بہت ہیں، جن کو احقر نے اپنی کتاب ”مقام صحابہ“ میں جمع کر دیا ہے، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے تمام صحابہ کرام کے عدل و ثقہ ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے۔ (معارف القرآن ۹۶/۸ پ ۲۶ سورہ فتح)

صحابہ کرام کی خطائیں اور ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے

آیات زیر بحث میں ”وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنٰی“ مذکور ہے، اور اس آیت میں جن کے لیے حسنیٰ کا وعدہ ہوا ان کے لیے جہنم کی آگ سے بہت دور رہنے کا اعلان ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی ضمانت دے دی کہ حضرات صحابہ کرام سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں بھی کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، توبہ کر لے گا یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و نصرت اور دین کی خدمات عظیمہ اور ان کے بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا، اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہو کر وہ صاف و بیباک ہو جائیں، یا دنیا کے مصائب و آفات اور زیادہ سے زیادہ برزخ میں کوئی تکلیف ان کے سینات کا کفارہ ہو جائے۔ (معارف القرآن ۲۹۹/۸ پ ۷۲)

آیات مذکورہ میں اگرچہ صحابہ کرام میں باہمی درجات کا تعامل ذکر کیا گیا ہے لیکن آخر میں فرمایا ”وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنٰی“، یعنی باوجود باہمی فرق مراتب کے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ یعنی جنت و مغفرت کا وعدہ سب ہی کے لیے کر لیا ہے، یہ وعدہ صحابہ کرام کے ان دونوں طبقوں کے لیے ہے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے یا بعد میں اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور مخالفین اسلام کا مقابلہ کیا اس میں تقریباً صحابہ کرام کی پوری جماعت شامل ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے افراد تو شاذ و نادر ہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اللہ کے لیے کچھ خرچ بھی نہ کیا ہو۔ اور مخالفین اسلام کے مقابلہ و مقاتلہ میں بھی شریک نہ ہوئے ہوں اس لیے قرآن کریم کا یہ اعلان مغفرت و رحمت پوری جماعت صحابہ کرام کے لیے عام اور شامل ہے۔

ابن حزم نے فرمایا کہ اس کے ساتھ قرآن کی دوسری آیت سورہ انبیاء کو ملاؤ جس میں فرمایا ہے ”إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰی أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ“ یعنی جن لوگوں کے لیے ہم نے حسنیٰ کو مقرر کر دیا ہے، وہ جہنم سے ایسے دور رہیں گے کہ اس کی تکلیف دہ آوازیں بھی ان کے کانوں تک نہ پہنچیں گی اور اپنی دلخواہ نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

صحابی کو عذاب قبر ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اور جن احادیث میں صحابہ کرام پر مرنے کے بعد عذاب کا ذکر آیا ہے، وہ عذاب آخرت و عذاب جہنم کا نہیں برزخی یعنی قبر کا عذاب ہے۔ یہ کوئی بعید نہیں کہ صحابہ کرام میں سے اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اتفاقاً توبہ کر کے اس سے پاک ہو جانے کا بھی موقع نہیں ہوا تو ان کو برزخی عذاب کے ذریعہ پاک کر دیا جائے گا، تاکہ آخرت کا عذاب ان پر نہ رہے۔ (معارف القرآن ۲۹۹/۸ پ ۷۲)

صحابہ کرام کو جانچنے و پرکھنے کا معیار قرآن و حدیث ہیں

نہ کہ تاریخی روایات و واقعات

خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام عام امت کی طرح نہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک واسطہ ہیں، ان کے بغیر نہ امت کو قرآن پہنچنے کا کوئی راستہ ہے اور نہ معانی قرآن اور تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اسلام میں ان کا ایک خاص مقام ہے ان کے مقامات کتب تاریخ کی رطب و یابس روایات سے نہیں پہچانے جاتے، بلکہ قرآن و سنت کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں۔

(معارف القرآن ۸/۲۹۹)

آج کل تاریخ کی جھوٹی سچی قوی ضعیف روایات کی بناء پر جو بعض لوگوں نے بعض حضرات صحابہ کو مورد طعن و الزام بنایا ہے اول تو اس کی بنیاد جو تاریخی روایات پر ہے، وہ بنیاد ہی متزلزل ہے، اور اگر کسی درجہ میں ان روایات کو قابل التفات مان بھی لیا جائے، تو قرآن و حدیث کے کھلے ہوئے ارشادات کے خلاف ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی وہ سب مغفور ہیں۔ (معارف ۸/۳۰۰)

اہل سنت و الجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ کی

تکریم و تعظیم و محبت اور مدح و ثنا کرنا واجب ہے

”وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنٰی“۔ (پ: ۵، سورہ نساء)

صحابہ کرام کے بارے میں پوری امت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام کی تعظیم و تکریم ان سے محبت رکھنا ان کی مدح و ثنا کرنا واجب ہے، اور ان کے آپس میں

جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے ان کے معاملہ میں سکوت کرنا کسی کو مورد الزام نہ بنانا لازم ہے۔ عقائد اسلامیہ کی تمام کتابوں میں اس اجماعی عقیدہ کی تصریحات موجود ہیں۔ (معارف القرآن ۸/۳۰۰)

تمام صحابہ مغفور و مرحوم ہیں

کسی صحابی کی طرف عیب یا برائی منسوب کرنا جائز نہیں

یہیں سے اہل سنت و الجماعت کے اس عقیدہ اور عمل کی تصدیق ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں، ان سے بڑے گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہوئے بھی ہیں لیکن اس کے باوجود امت کے لیے یہ جائز نہیں کہ ان کی طرف کسی برائی اور عیب کو منسوب کرے۔

جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتنی بڑی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر کے ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمایا اور ان کو رضی اللہ عنہم و رضوانہ کا مقام عطا فرمایا تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرے۔ (معارف القرآن ۲/۲۱۲)

صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات و نزاع کی وجہ سے کسی

صحابی پر الزام و اعتراض اور طعن و تشنیع کرنا جائز نہیں

حافظ ابن تیمیہؒ نے عقیدہ واسطیہ میں فرمایا ہے کہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان جو اختلاف اور قتل و قتال ہوئے ہیں ان میں سے کسی پر الزام و اعتراض کرنے سے باز رہیں، وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں جو روایات ان کے متعلق

کرتے اور اپنے نفس پر اس کی سزا جاری کرنے کے لیے کوشش کرتے تھے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا اور جب تک توبہ قبول ہو جانے کا یقین نہ ہو جائے بندھا کھڑا رہتا تھا، اور پھر ان میں سے ہر ایک کی حسنت اتنی ہیں کہ خود گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں، ان سب پر مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خطاؤں کی مغفرت کا عام اعلان فرمادیا اور صرف مغفرت ہی نہیں بلکہ رضی اللہ عنہم ورضوانہ فرما کر اپنی رضا کی بھی سند دے دی۔ (معارف القرآن ۸/۳۰۰)

مشاجرات صحابہ کی وجہ سے کسی صحابی کو مطعون کرنا جائز نہیں

اس لیے ان کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے ان کی وجہ سے ان میں سے کسی کو برا نہ کہنا اس پر طعن و تشنیع کرنا قطعاً حرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق موجب لعنت اور اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)۔ (معارف القرآن ۸/۳۰۰)

صحابہ کرام کی کوتاہیوں میں بلا ضرورت غور و خوض، بحث و

تجسس کرنا بد بختی اور اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ جن خیارات کے متعلق اللہ تعالیٰ نے غفران و مغفرت کا یہ اعلان فرمادیا ہے اگر ان سے کوئی لغزش یا گناہ ہوا بھی ہے تو یہ آیت اس کی معافی کا اعلان کر رہی ہے، پھر ان کے ایسے معاملات کو جو مستحسن نہیں ہیں غور فکر اور بحث و مباحثہ کا میدان بنانا بد بختی اور بظاہر اس آیت کی مخالفت ہے لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ۔ یہ آیت روافض کے قول کی واضح تردید ہے جو ابو بکر و عمر اور دوسرے صحابہ پر کفر و نفاق کے الزام لگاتے ہیں۔ (معارف القرآن ۸/۸۱)

آئی ہیں ان میں بکثرت تو جھوٹی ہیں، اور غلط ہیں، جو دشمنوں نے اڑائی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن میں کمی بیشی کر کے اپنی اصلیت کے خلاف کردی گئی ہیں اور جو بات صحیح بھی ہے تو صحابہ کرام اس میں اجتہادی رائے کی بنا پر معذور ہیں، اور بالفرض جہاں وہ معذور بھی نہ ہوں تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ ”إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ“ یعنی اعمال صالحہ سے برے اعمال کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کے اعمال صالحہ کے برابر کسی دوسرے کے اعمال نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم کے جتنے وہ مستحق ہیں، کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کے اعمال پر مواخذہ کرے، اور ان میں سے کسی پر طعن و اعتراض کی زبان کھولے۔ (عقیدہ واسطیہ ملخصاً)۔ (معارف القرآن ۲/۲۱۳، آل عمران)

ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدہ واسطیہ میں تمام امت محمدیہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے مشاجرات صحابہ کے متعلق لکھا ہے۔

ویمسکون عما شجر بین الصحابة (اہل سنت والجماعت سکوت اختیار کرتے ہیں ان اختلافی معاملات سے جو صحابہ کرام کے درمیان پیش آئے)۔

(معارف القرآن ۸/۳۰۱)

صحابہ کرام کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تدارک

ان میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش اور غلطی بھی ہوتی ہے تو اکثر وہ اجتہادی خطا ہوتی ہے، جس پر کوئی گناہ نہیں، بلکہ حسب تصریح احادیث صحیحہ ایک اجر ہی ملتا ہے اور اگر فی الواقع کوئی گناہ ہو گیا تو اول تو وہ ان کے عمر بھر کے اعمال حسنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی نصرت و خدمت کے مقابلہ میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے، اور پھر ان میں خشیت اور خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے گناہ سے بھی لرز جاتے اور فوراً توبہ

دلائل و شواہد اور کتب عقائد کی تصریحات

(۱) فاروق اعظم نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ وہ منافق نہیں مومن مخلص ہیں، مگر یہ غلطی ان سے سرزد ہوگئی اس لیے اس کو معاف فرمادیا، اور فرمایا کہ یہ اہل بدر میں سے ہیں، اور شاید اللہ تعالیٰ نے تمام حاضرین بدر کے متعلق مغفرت اور معافی کا حکم نافذ کر دیا ہے۔ (یہ روایت حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے)۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے حضرت عثمان اور بعض صحابہ کرام پر غزوہ احد میں کے اسی واقعہ کا ذکر کر کے طعن کیا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اس پر حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا کہ جس چیز کی معافی کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا اس پر طعن کرنے کا کسی کو کیا حق ہے۔ (صحیح بخاری)

(۳) اسی لیے اہل سنت والجماعت کے عقائد کی کتابیں سب اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرام کی تعظیم اور ان پر طعن و اعتراض سے پرہیز واجب ہے۔

علمائے متکلمین و محققین کی تصریحات

(۱) عقائد نسفیہ میں ہے ”ویکف عن ذکر الصحابة الا بخیر“ یعنی واجب ہے کہ صحابہ کا ذکر بغیر خیر اور بھلائی کے نہ کرے۔

(۲) شرح مسامرہ ابن ہمام میں ہے:

اعتقاد اہل السنة تزكية جميع الصحابة والثناء عليهم۔
یعنی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام کو عدول وثقات سمجھیں، اور ان کا ذکر مدح و ثناء کے ساتھ کریں۔

(۳) شرح مواقف میں ہے ”يجب تعظيم الصحابة كلهم والكف

عن القدح“ یعنی تمام صحابہ کی تعظیم واجب ہے اور ان پر اعتراض سے باز رہنا واجب ہے۔ (معارف القرآن ۲۱۲/۲، سورہ آل عمران، پ: ۴)

(۴) امام احمد کا رسالہ جو بروایت اصطخری معروف ہے اس کے بعض الفاظ یہ ہیں: ”لا يجوز لأحد أن يذكر شيئاً من مساوئهم ولا يطعن على أحد منهم بعيب ولا نقص، فمن فعل ذلك وجب تأديبه“۔

ترجمہ: کسی کے لیے جائز نہیں کہ صحابہ کرام کی کسی برائی کا ذکر کرے، یا ان میں سے کسی پر طعن کرے یا کوئی عیب یا نقصان ان کی طرف منسوب کرے اور جو ایسا کرے اس کو سزا دینا واجب ہے۔ (شرح عقیدہ واسطیہ معروف بہ الدرۃ المضيہ ص: ۳۸۶)

(۵) ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں صحابہ کرام کے متعلق فضائل و خصوصیات کی بہت سی آیات اور روایات حدیث لکھنے کے بعد لکھا ہے:

وهذه مما لا نعلم خلافا بين اهل الفقه والعلم من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم والتابعين لهم باحسان وسائر اهل السنة والجماعة فانهم مجتمعون على ان الواجب الثناء عليهم والاستغفار والترحم عليهم والترضى عنهم واعتقاد محبتهم وموالاتهم وعقوبة من أساء فيهم القول۔

ترجمہ: جہاں تک ہمارے علم میں ہے ہم اس معاملہ میں علماء فقہاء صحابہ و تابعین اور تمام اہل سنت والجماعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پاتے کیونکہ سب کا اس پر اجماع ہے کہ امت پر واجب ہے کہ سب صحابہ کرام کی مدح و ثناء کرے اور ان کے لیے استغفار کرے اور ان کو اللہ کی رحمت و رضا کے ساتھ ذکر کرے، ان کی محبت اور دوستی پر ایمان رکھے اور جو ان کے معاملہ میں بے ادبی کرے اس کو سزا دے۔

(معارف القرآن: ۳۰۰/۸، سورہ حدید، پ: ۲۷)

علیہ وسلم نے فرمایا حضرت طلحہ کے بارے میں ان طلحہ شہید یمشی علی وجہ الارض یعنی طلحہ روئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں۔

اب اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت طلحہ کا جنگ کے لیے نکلنا کھلا گناہ اور عصیان تھا تو اس جنگ میں مقتول ہو کر وہ ہرگز شہادت کا مرتبہ حاصل نہ کرتے، اسی طرح حضرت طلحہ کا یہ عمل تاویل کی غلطی اور ادائے واجب میں کوتاہی قرار دیا جاسکتا تو بھی آپ کو شہادت کا مقام حاصل نہ ہوتا کیونکہ شہادت تو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اطاعت ربانی میں قتل ہوا ہو، لہذا ان حضرات کے معاملہ کو اسی عقیدہ پر محمول کرنا ضروری ہوگا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) اس بات کی دوسری دلیل وہ صحیح اور معروف و مشہور احادیث ہیں جو خود حضرت علیؑ سے مروی ہیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”زبیر کا قاتل جہنم میں ہے۔“

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”صفیہ کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی خبر دے دو“ جب یہ بات ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس لڑائی کی وجہ سے عاصی اور گنہگار نہیں ہوئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت طلحہ کو شہید نہ فرماتے، اور حضرت زبیر کے قاتل کے بارے میں جہنم کی پیشین گوئی نہ کرتے۔

نیز ان کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہے جن کی جنتی ہونے کی شہادت تقریباً متواتر ہے۔ اسی طرح جو حضرات صحابہ ان جنگوں میں کنارہ کش رہے انہیں بھی تاویل میں خطا کا نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان کا طرز عمل بھی اس لحاظ سے درست تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجتہاد میں اسی رائے پر قائم رکھا، جب یہ بات ہے تو اس وجہ سے ان حضرات پر لعن طعن کرنا ان سے براءت کا اظہار کرنا اور انہیں فاسق قرار دینا۔ ان کے فضائل و مجاہدات

فصل

مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

”وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا“ (الآیۃ)

(سورہ حجرات پ ۲۶)

امام ابو بکر ابن العربیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت قتال بین المسلمین کی تمام صورتوں کو حاوی اور شامل ہے، اس میں وہ صورت بھی داخل ہے جس میں دونوں فریق کسی حجت شرعی کے تحت جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، صحابہ کرام کے مشاجرات اسی قسم میں داخل ہیں۔

قرطبی نے ابن عربی کا یہ قول نقل کر کے اس جگہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کے عمل کے متعلق ہدایات دی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے:

”یہ جائز نہیں کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے اس لیے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرز عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور سب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں، اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کف لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقہ پر کریں، کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے۔“

(۲) اس کے علاوہ متعدد سندوں سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

اور ان عظیم دینی مقامات کو کالعدم کر دینا کسی طرح درست نہیں۔

(۴) بعض علماء سے پوچھا گیا کہ اس خون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات میں بہایا گیا تو انہوں نے جواب میں یہ آیت پڑھ دی 'تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ' کہ یہ ایک امت تھی جو گزر گئی اس کے اعمال اس کے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

(۵) کسی اور بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا 'ایسے خون ہیں کہ اللہ نے میرے ہاتھوں کو اس میں رنگنے سے بچایا، اب میں اپنی زبان کو ان سے آلودہ نہیں کروں گا' مطلب یہی تھا کہ میں کسی ایک فریق کو کسی ایک معاملے میں یقینی طور پر خطا کار ٹھہرانے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔

(۶) علامہ ابن فورک فرماتے ہیں:

”ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ صحابہ کرام کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی، وہ حضرات آپس کے ان اختلافات کے باوجود ولایت اور نبوت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے بالکل یہی معاملہ صحابہ کے درمیان پیش آنے والے واقعات کا بھی ہے۔“

(۷) اور حضرت محاسبی فرماتے ہیں کہ:

جہاں تک اس خونریزی کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس میں خود صحابہ کے درمیان اختلاف تھا۔

(۸) اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہ کے باہمی قتال کے بارے میں پوچھا گیا

تو انہوں نے فرمایا کہ ”ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے اور ہم نہیں جانتے، جس معاملہ پر تمام صحابہ کا اتفاق ہے ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں اور جس معاملہ میں ان کے درمیان اختلاف ہے اس میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔“

حضرت محاسبی فرماتے ہیں کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حضرت حسن بصریؒ نے فرمائی ہے، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرام نے جن چیزوں میں دخل دیا ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے، لہذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں اور جس میں ان کا اختلاف ہو اس میں خاموشی اختیار کریں۔

اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہی تھی، اس لیے کہ دین کے معاملہ میں وہ سب حضرات شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ (معارف القرآن: ۸/۱۱۴)

صحابہ کو برا بھلا کہنا جائز نہیں

(۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استغفار اور دعا کرنے کا حکم دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان کے آپس میں جنگ و جدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے (اس لیے کسی مسلمان کو مشاجرات صحابہ کی وجہ سے ان میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں)۔

(۱۰) حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ امت اس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی جب تک کہ اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت و ملامت نہ کریں گے۔

ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ اور صفیہ رضی اللہ عنہما یہ سب حج کے لیے تشریف لے گئیں تھیں، وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور بغاوت کے واقعات سنے تو سخت غمگین ہوئیں اور مسلمانوں کے باہمی افتراق سے نظام مسلمین میں خلل اور فتنہ کا اندیشہ پریشان کئے ہوئے تھا، اسی حالت میں حضرت طلحہ اور زبیر اور نعمان بن بشیر اور کعب بن عجرہ اور چند دوسرے صحابہ کرام مدینہ سے بھاگ کر مکہ معظمہ پہنچے کیونکہ قاتلان عثمانؓ ان کے بھی قتل کے درپے تھے، یہ حضرات اہل بغاوت کے ساتھ شریک نہیں تھے، بلکہ ان کو ایسے فعل سے روکتے تھے، حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے بعد وہ ان کے بھی درپے تھے، اس لیے یہ لوگ جان بچا کر مکہ معظمہ پہنچ گئے اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشورہ طلب کیا حضرت صدیقہؓ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ اس وقت تک مدینہ طیبہ نہ جائیں جب تک کہ باغی لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے گرد جمع ہیں، اور وہ ان سے قصاص لینے سے مزید فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں تو آپ لوگ کچھ روز ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں اپنے آپ کو مامون سمجھیں، جب تک کہ امیر المؤمنین انتظام پر قابو نہ پالیں، اور تم لوگ جو کچھ کوشش کر سکتے ہو اس کی کرو کہ یہ لوگ امیر المؤمنین کے گرد سے متفرق ہو جائیں، اور امیر المؤمنین ان سے قصاص یا انتقام لینے پر قابو پالیں۔

یہ حضرات اس پر راضی ہو گئے، اور ارادہ بصرہ چلے جانے کا کیا، کیونکہ اس وقت وہاں مسلمانوں کے لشکر جمع تھے، ان حضرات نے وہاں جانے کا قصد کر لیا تو ام المؤمنینؓ سے بھی درخواست کی کہ انتظام حکومت برقرار ہونے تک آپ بھی ہمارے ساتھ بصرہ میں قیام فرمائیں۔

اور اس وقت قاتلان عثمان اور مفسدین کی قوت و شوکت اور حضرت علیؓ کا ان پر حد شرعی جاری کرنے سے بے قابو ہونا خود نبی البلاغہ کی روایت سے واضح ہے، یاد رہے

(۱۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب کسی کو دیکھو کہ کسی صحابی کو برا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں زیادہ برا ہے اس پر اللہ کی لعنت، یہ ظاہر ہے کہ زیادہ برے صحابہ تو ہونہیں سکتے، یہی ہوگا جو ان کی برائی کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو برا کہنا سبب لعنت ہے۔ (معارف القرآن ۳۸۱/۸)

صحابہ کرام کے متعلق ایک ضروری ہدایت

(۱۲) عوام بن حوشبؓ نے فرمایا کہ میں نے اس امت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کے فضائل اور محاسن بیان کیا کرو، تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہو، اور وہ مشاجرات اور اختلافات جو ان کے درمیان پیش آئے ہیں ان کا ذکر نہ کیا کرو۔ جس سے ان کی جرأت بڑھے۔ (اور وہ بے ادب ہو جائیں)۔

(معارف القرآن ۳۸۲/۸)

جنگ جمل کا مختصر واقعہ

حضرت ام المؤمنین صدیقہ عائشہؓ کا سفر بصرہ اور جنگ

جمل کے واقعہ پر روافض کے ہفوات

اوپر یہ بات وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ آیت مذکورہ میں ”وَقَرْنَ فِی بُیُوتِكُنَّ“ کا مفہوم خود قرآنی اشارات بلکہ تصریحات سے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اور آپ کے بعد صحابہ کرام کے اجماع سے یہ ثابت ہے کہ مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں، جن میں حج و عمرہ وغیرہ دینی ضروریات شامل ہیں، صدیقہ عائشہؓ اور

واضح کرنے کے لیے چند سطور لکھی جاتی ہیں۔

باہمی فتنوں اور جھگڑوں کے وقت جو صورتیں دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں ان سے کوئی اہل بصیرت و تجربہ غافل نہیں ہو سکتا یہاں بھی صورت یہ پیش آئی کہ مدینہ سے آئے ہوئے صحابہ کرام کی معیت میں حضرت صدیقہ کے سفر بصرہ کو منافقین اور مفسدین نے حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کے سامنے صورت بگاڑ کر اس طرح پیش کیا کہ یہ سب اس لیے بصرہ جا رہے ہیں کہ وہاں سے لشکر ساتھ لے کر آپ کا مقابلہ کریں، اگر آپ امیر وقت ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے پہلے وہیں جا کر روکیں، حضرت حسن و حسین و عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام نے اس رائے سے اختلاف بھی کیا اور مشورہ یہ دیا کہ آپ ان کے مقابلہ پر لشکر کشی اس وقت تک نہ کریں جب تک صحیح حال معلوم نہ ہو جائے، مگر کثرت دوسری طرف رائے دینے والوں کی تھی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرف مائل ہو کر لشکر کے ساتھ نکل آئے، اور یہ شریر اہل فتنہ و بغاوت بھی آپ کے ساتھ نکلے۔

جب یہ حضرات بصرہ کے قریب پہنچے تو حضرت قعقاع کو ام المؤمنین کے پاس دریافت حال کے لیے بھیجا، انہوں نے عرض کیا کہ ام المؤمنین آپ کے یہاں تشریف لانے کا کیا سبب ہوا، تو صدیقہ نے فرمایا ”ای بنی الإصلاح بین الناس“ یعنی میرے پیارے بیٹے! میں اصلاح بین الناس کے ارادہ سے یہاں آئی ہوں۔ پھر حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی قعقاع کی مجلس میں بلا لیا، قعقاع نے اس سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ قاتلان عثمان پر حد شرعی جاری کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے، حضرت قعقاع نے سمجھایا کہ یہ کام تو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی جماعت منظم اور مستحکم نہ ہو جائے، اس لیے آپ حضرات پر لازم ہے کہ اس وقت آپ مصالحت کی صورت اختیار کر لیں۔

کہ نہج البلاغہ کو شیعہ حضرات مستند مانتے ہیں، نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت امیر سے ان کے بعض اصحاب و رفقاء نے خود کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو سزا دے دیں جنہوں نے عثمان غنیؓ پر حملہ کیا تو بہتر ہوگا، اس پر حضرت امیرؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میں اس بات سے بے خبر نہیں جو تم کہتے ہو مگر یہ کام کیسے ہو جب کہ مدینہ پر یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں، اور تمہارے غلام اور آس پاس کے اعراب بھی ان کے ساتھ لگ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی سزا کے احکام جاری کر دوں تو نافذ کس طرح ہوں گے۔

حضرت صدیقہؓ کو ایک طرف حضرت علیؓ کی مجبوری کا اندازہ تھا دوسری طرف یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے مسلمانوں کے قلوب زخمی ہیں، اور ان کے قاتلوں سے انتقام لینے میں تاخیر جو امیر المؤمنین علیؓ کی طرف سے مجبوری دیکھی جا رہی تھی اور مزید یہ کہ قاتلان عثمانؓ امیر المؤمنین کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے، جو لوگ حضرت امیر المؤمنین کی مجبوری سے واقف نہ تھے ان کو اس معاملہ میں ان سے بھی شکایت پیدا ہو رہی تھی ممکن تھا کہ یہ شکوہ و شکایت کسی دوسرے فتنے کا آغاز نہ بن جائے، اس لیے لوگوں کو فہمائش کر کے صبر کرنے اور امیر المؤمنین نے حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان فرمایا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا، اور ایسے شدید فتنہ کے وقت اصلاح بین المؤمنین کا کام جس قدر اہم دینی خدمت تھی وہ بھی ظاہر ہے، اس کے لیے اگر ام المؤمنین نے بصرہ کا سفر محارم کے ساتھ اور پردہ کے آہنی ہودج میں اختیار فرمالیا تو اس کو جو شیعہ اور روافض نے ایک طوفان بنا کر پیش کیا ہے کہ ام المؤمنینؓ نے احکام قرآن کی خلاف ورزی کی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

آگے منافقین اور مفسدین کی شرارت نے جو صورت جنگ باہمی کی پیدا کر دی اس کا خیال کبھی صدیقہؓ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، اس آیت کی تفسیر کے لیے اتنا ہی کافی ہے آگے واقعہ جنگ جمل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مگر اختصار کے ساتھ حقیقت

لیے تشریف لے گئے، تو اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر یہ فرماتے تھے کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر کر نسیاً منسیاً ہو گیا ہوتا۔

اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت ام المؤمنین جب قرآن میں یہ آیت پڑھتیں ”وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ“ تو رونے لگتیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔ (رواہ عبد اللہ بن احمد فی زوائد ابن المنذر وابن شیبہ عن مسروق، روح)

آیت مذکورہ پڑھنے پر رونا اس لیے نہ تھا کہ قراری البیوت کی خلاف ورزی ان کے نزدیک گناہ تھی یا سفر ممنوع تھا بلکہ گھر سے نکلنے پر جو واقعہ ناگوار اور حادثہ شدیدہ پیش آ گیا اس پر طبعی رنج و غم اس کا سبب تھا، (یہ سب روایات اور پورا مضمون تفسیر روح المعانی سے لیا گیا ہے)۔ (معارف القرآن ۷/۱۳۸، سورہ احزاب، پ: ۲۲)

ان بزرگوں نے اس کو تسلیم کیا، حضرت قعقاع نے جا کر امیر المؤمنین کو اس کی اطلاع دے دی، وہ بھی بہت مسرور ہوئے اور مطمئن ہو گئے، اور سب لوگوں نے واپسی کا قصد کر لیا، اور تین روز اس میدان میں قیام اس حال پر رہا کہ کسی کو اس میں شک نہیں تھا کہ اب دونوں فریقوں میں مصالحت کا اعلان ہو جائے گا، اور چوتھے دن صبح کو یہ اعلان ہونے والا تھا اور حضرت امیر المؤمنین کی ملاقات حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ ہونے والی تھی جس میں یہ قاتلان عثمان غنی شریک نہیں تھے، یہ چیز ان لوگوں پر سخت گراں گذری، اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ تم اول حضرت عائشہؓ کی جماعت میں پہنچ کر قتل و غارت گری شروع کر دو، تاکہ وہ اور ان کے ساتھی یہ سمجھیں کہ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی طرف سے عہد شکنی ہوئی، اور یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو کر حضرت علیؓ کے لشکر پر ٹوٹ پڑیں، ان کی یہ شیطانی چال چل گئی، اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شامل ہونے والے مفسدین کی طرف سے جب حضرت صدیقہؓ کی جماعت پر حملہ ہو گیا تو وہ سمجھنے میں معذور تھے کہ یہ حملہ امیر المؤمنین کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے، اس کی جوابی کارروائی شروع ہو گئی، حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے یہ ماجرا دیکھا تو قتال کے سوا چارہ نہ رہا، اور جو حادثہ باہمی قتل و قتال کا پیش آنا تھا آ گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون یہ واقعہ ٹھیک اسی طرح طبری اور دوسرے ثقافت مؤرخین نے حضرت حسن اور حضرت عبد اللہ بن جعفر اور عبد اللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے نقل کیا ہے۔ (روح المعانی)

غرض مفسدین و مجرمین کی شرارت اور فتنہ انگیزی کے نتیجے میں ان دونوں مقدس گروہوں میں غیر شعوری طور پر قتال کا واقعہ پیش آ گیا، اور جب فتنہ فرو ہوا تو دونوں ہی حضرات اس پر سخت غمگین ہوئے حضرت عائشہؓ کو یہ واقعہ یاد آ جاتا تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا، اسی طرح حضرت امیر المؤمنین علیؓ مرتضیٰ کو بھی اس واقعہ پر سخت صدمہ پیش آیا۔ فتنہ فرو ہونے کے بعد مقتولین کی لاشوں کو دیکھنے کے

قیاس کی حجیت

”إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ“۔ (آل عمران پ ۳)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس بھی حجت شرعیہ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی، یعنی جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر باپ (اور ماں) کے پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے پیدا کیا تو یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر قیاس کرنے کی طرف اشارہ فرمادیا۔ مظہری۔

(معارف القرآن ۸۵/۲، آل عمران)

اجتہاد فی الفروع قیامت تک باقی رہے گا

یہ نہ سمجھا جائے کہ اصطلاحی اجتہاد ختم ہونے کے ساتھ وہ بھی (اجتہاد فی الفروع) ختم ہو گیا بلکہ اب بھی باقی ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس میں اختلاف بھی رہے گا، جس اجتہاد کو حضرات فقہاء نے عادتاً منقطع قرار دیا ہے وہ اجتہاد قواعد و ضوابط اور کلیات بنانے کے متعلق ہے، لیکن کسی واقعہ جزئیہ کا کسی واقعہ یا کسی قاعدہ کلیہ کے اندر داخل کرنا اکثر محتاج اجتہاد ہوتا ہے اور یہ اجتہاد ہر مبتلی بہ کو (بشرط اہلیت) کرنا پڑتا ہے۔ اور اس میں بھی اجتہادی غلطی اور اختلاف ہو سکتا ہے۔

(منقول از رسالہ - المفتی ص: ۱۰، محرم ۱۳۵۴ھ)

مسائل جدیدہ میں اجتہاد کرنے کا وجوب

”وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ“۔ (سورہ نساء، پ ۵)

باب ۶

اجتہاد و قیاس کا بیان

اجتہاد اور قیاس کا ثبوت

”فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ“۔ (سورہ نساء پ ۵)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اگر تمہارا کسی امر کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو تم اللہ اور رسول کی جانب رجوع کرو۔

کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کتاب و سنت کے احکام منصوصہ کی جانب رجوع کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر احکام منصوصہ موجود نہیں ہیں تو ان کے نظائر پر قیاس کر کے رجوع کیا جائے گا۔ فَرُدُّوهُ کے الفاظ عام ہیں، جو دونوں صورتوں کو شامل ہیں۔ (معارف القرآن ۴۵۳/۲، سورہ نساء)

قیاس کی حقیقت

”أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ“۔

اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن و سنت میں نہ ملے تو انہی میں غور و فکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے، اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ۴۹۰/۲، نساء)

ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کون سا پہلو اختیار کرے، دونوں صورتوں میں نفع و نقصان کا احتمال رہتا ہے تو اس کا بہترین عمل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہل استنباط کی طرف رجوع کرو وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔

(احکام القرآن للجصاص مختصراً، معارف القرآن ۲/۴۹۳، نساء)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی قیاس و استدلال کے مکلف تھے

”لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ“۔ (سورہ نساء، پ ۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعہ احکام کے استنباط کے مکلف تھے، اس لیے کہ پہلی آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور دوسرے اولوالامر کی طرف اس کے بعد فرمایا ”لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ“ اور یہ حکم عام ہے جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی ذات بھی استنباط احکام کی مکلف تھی۔

(احکام القرآن للجصاص، معارف القرآن ۲/۴۹۳، نساء)

”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ“۔ (سورہ نساء، پ ۵)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مسائل میں جن میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح وارد نہ ہو اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا اور مہمات کے فیصلوں میں آپ بہت سے فیصلے اپنے اجتہاد سے بھی فرماتے تھے۔ (معارف القرآن ۲/۵۴۲، نساء)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے احکام اجتہاد و قیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، تو ان کی جانب رجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت تامہ رکھتے ہیں۔

اس بیان سے چند امور مستفاد ہوئے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائے گا (۲) دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں، جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعہ استنباط کریں۔

(۴) چوتھے یہ کہ عوام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔ (احکام القرآن للجصاص)

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اڑاؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور و فکر کر کے جو بات بتائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائل حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ آیت ”إِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ“ میں دشمن کا کوئی ذکر نہیں ہے لہذا امن اور خوف عام ہے جس طرح ان کا تعلق دشمن سے ہے اسی طرح مسائل حوادث سے بھی ہے، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کی خصوصیت

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح نہ تھا، جس میں غلطی اور خطا کا احتمال ہمیشہ باقی رہتا ہے بلکہ جب آپ کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے فرماتے تو اگر اس میں کوئی غلطی ہو جاتی تو حق تعالیٰ اس پر آپ کو متنبہ فرما کر آپ کے فیصلہ کو صحیح اور حق کے مطابق کر دیتے تھے، اور جب آپ نے کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی چیز نہ آئی تو یہ علامت اس کی تھی کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اس کے نزدیک صحیح ہے۔

(معارف القرآن ۵۴۲/۲، نساء)

اجتہاد و استنباط غلبہ ظن کا فائدہ دیتا ہے علم یقینی کا نہیں

استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے بلکہ اس حکم کے خطا ہونے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے جو عمل کے لیے کافی ہے۔ (تفسیر کبیر احکام القرآن للجصاص، معارف ۲۹۴/۲، نساء)

کون سا اجتہاد صحیح اور معتبر ہے

”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ“ سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجتہاد رائے وہی معتبر ہے جو قرآنی اصول اور نصوص سے ماخوذ ہو، خالص رائے اور خیال معتبر نہیں۔ اور نہ اس کو شریعت میں اجتہاد کہا جاسکتا ہے۔

(معارف القرآن ۵۴۲/۲، نساء)

اجتہاد کا محل و موقع، اجتہاد کی اجازت و گنجائش کہاں ہے

اجتہاد صرف ان مسائل میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی فیصلہ موجود نہیں۔

یا ایسا مبہم ہے کہ اس کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں یا چند آیات و روایات سے ظاہر اُردو متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ایسے مواقع میں صرف ان لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائط اجتہاد موجود ہیں۔ جو شخص کسی منصوص مسئلہ میں اپنی رائے چلائے وہ اجتہادی اختلاف نہیں۔

اسی طرح شرائط اجتہاد جس شخص میں موجود نہیں اس کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف نہیں کہا جاسکتا اس کے قول کا کوئی اثر مسئلہ پر نہیں پڑتا، جیسے آج کل بہت سے لکھے پڑھے لوگوں نے یہ سن لیا ہے کہ اسلام میں اجتہاد بھی ایک اصول ہے اور ان منصوصات شرعیہ میں رائے زنی کرنے لگے جس میں کسی امام مجتہد کو بھی بولنے کا حق نہیں، اور یہاں تو شرائط اجتہاد کیا نفس علم دین سے بھی واقفیت نہیں ہوتی العیاذ باللہ۔

(معارف القرآن ۱۳۵/۲، آل عمران)

کون لوگ اجتہاد کر سکتے ہیں؟

صرف ان لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائط اجتہاد موجود ہیں، مثلاً قرآن و حدیث کے متعلق تمام علوم و فنون کی مکمل مہارت، عربی زبان کی مکمل مہارت، صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کی مکمل واقفیت وغیرہ۔

(معارف القرآن ۱۳۵/۲، نساء)

اجتہاد کرنے کی اجازت ہر ایک کو نہیں

”أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ“۔ (سورہ نساء، پ ۵)

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کرے لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ تدبر کے درجات متفاوت ہیں، اور ہر ایک کا حکم الگ ہے۔ مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآن حکیم سے دوسرے مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مبادیات کو حاصل کرے تاکہ وہ نتائج کا استخراج صحیح کر سکے، اور اگر اس نے مقدمات کو بالکل حاصل نہ کیا یا اس نے ناقص حاصل کیا جن اوصاف و شرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے، تو ظاہر ہے کہ نتائج غلط نکالے گا۔ اب اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

اگر ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اعتراض کرنے لگے، کہ ملک میں علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی ہے، مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔

یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں پل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینئروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے میں بھی بحیثیت شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں۔

یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانون ملک کی تشریح و تعبیر پر صرف ماہرین قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی میں بھی عاقل بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کر سکتا ہوں۔ اس آدمی سے یہی کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ بحیثیت شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لیے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لیے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اٹھاؤ پھر بلاشبہ تم بھی یہ تمام

خدمتیں انجام دے سکتے ہو، لیکن یہی بات اگر قرآن و سنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لیے کہی جائے تو اس پر علماء کی اجارہ داری کے آوازے کسے جاتے ہیں کیا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کرنے کے لیے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن و سنت ہی کا علم ایسا لا وارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملہ میں ہر شخص کو اپنی تشریح و تعبیر کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لیے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔ (معارف القرآن ۲/۴۸۹، نساء)

اجتہاد کی اجازت اور مجتہد کے لیے اجر و ثواب کا وعدہ

”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“۔ (سورہ آل عمران، پ ۴)

آیت میں جس تفرق و اختلاف کی مذمت ہے اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصول دین میں ہو، یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، چنانچہ آیت میں یہ قید کہ ”احکام واضح آنے کے بعد“ اس امر پر واضح قرینہ ہے، کیونکہ اصول دین سب واضح ہوتے ہیں اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی۔

لیکن جو فروع غیر واضح ہیں کسی نص صریح نہ ہونے کی وجہ سے یا نصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے ایسے فروع میں رائے و اجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے، اور وہ صحیح حدیث اس کی اجازت کے لیے کافی ہے جس کو بخاری و مسلم نے مرفوعاً عمرو بن العاص سے روایت کی ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو، تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جس اختلاف اجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہو سکتا۔ (معارف ۲/۱۳۳، آل عمران)

جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کے سب اللہ ہی کے احکام تھے۔ اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسلک اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکام خدا و رسول ہی کے کہلائیں گے.....

یہ اختلاف ہے جو رحمت ہی رحمت اور لوگوں کے لیے وسعت و سہولت کا ذریعہ اور بہت سے مفید نتائج کا حامل ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ فروعی مسائل میں رایوں کا اختلاف جہاں تک اپنی حد کے اندر رہے وہ کوئی مضر چیز نہیں بلکہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو کھولنے اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں معین ہے۔ (معارف القرآن ۳/۳۶۴، انعام)

اختلاف رائے عقل و دیانت کا تقاضا ہے

ائمہ مجتہدین کا اختلاف اختلاف رحمت ہے

اہل عقل و بصیرت پر مخفی نہیں کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں جن میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، ان میں اختلاف کرنا عقل و دیانت کا عین مقتضی ہوتا ہے، ان میں اتفاق صرف دو صورتوں سے ہو سکتا ہے، یا تو مجمع میں کوئی اہل بصیرت و اہل رائے نہ ہو، ایک نے کچھ کہہ دیا سب نے مان لیا اور یا پھر جان بوجھ کر کسی کی رعایت و مروت سے اپنے ضمیر اور اپنی رائے کے خلاف دوسرے کی بات پر صا کر دیا ورنہ اگر عقل و دیانت دونوں موجود ہوں تو رائے کا اختلاف ضروری ہے اور یہ اختلاف کبھی کسی حال میں مضر بھی نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کے لیے بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے، اسمبلیوں میں حزب اختلاف کو اسی بنیاد پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قرآن و سنت کے مجملات اور مبہمات کی تشریح و تعبیر میں اسی طرح کے اختلافات کو ”رحمت“ کہا گیا ہے جو اسلام کے عہد اول سے صحابہ و تابعین اور پھر ائمہ

فصل

اجتہادی اختلاف کا بیان

مجتہدین کا اجتہادی اختلاف رحمت ہے

اس جگہ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے وہ وہ اختلاف ہے جو اصول اور عقائد میں ہو، یا نفسانی اغراض و ہوا کی وجہ سے ہو، اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں، جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے اصول اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرن اول سے صحابہ و تابعین میں ہوتا چلا آیا ہے جن میں فریقین کی حجت قرآن و سنت اور اجماع سے ہے، اور ہر ایک کی نیت قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل ہے۔ مگر قرآن و سنت کے مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی، فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے، ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے۔

جامع صغیر میں بحوالہ نصر مقدسی و بیہقی و امام الحرمین یہ روایت نقل کی ہے کہ ”اختلاف امتی رحمة“ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

امت محمدیہ کی خصوصیت اس لیے اختیار فرمائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء متقین میں جو اختلاف ہوگا وہ ہمیشہ اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہوگا، اور صدق نیت اور للہیت سے ہوگا کوئی نفسانی غرض جاہ و مال کی ان کے اختلاف کی محرک نہ ہوگی اس لیے وہ کسی جنگ و جدل کا سبب بھی نہ بنے گا۔ بلکہ علامہ عبدالرؤف مناوی شارح

اور اسی فتنے کے آخر میں جب کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان میدان جنگ گرم تھا، روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پا کر حضرت معاویہؓ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا، تو حضرت معاویہؓ کا جواب یہ تھا کہ ہمارے اختلاف سے دھوکہ نہ کھاؤ، اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رُخ کیا تو علی کے لشکر کا پہلا سپاہی، جو تمہارے مقابلے کے لیے نکلے گا وہ معاویہ ہوگا، معلوم یہ ہوا کہ باہمی اختلاف جو منافقین کی گہری سازشوں سے تشدد کا رُخ اختیار کر چکا تھا، اس میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق کسی کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تعبیر کتاب و سنت کے ماتحت اختلاف رائے جو صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین میں رہا ہے تو بلاشبہ رحمت ہی ہے اس کا کوئی پہلو نہ مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا، اور نہ آج ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ انہیں حدود کے اندر رہے، جن میں ان حضرات نے رکھا تھا کہ ان کا اثر نماز، جماعت، امامت اور معاشرت کے کسی معاملے پر نہ پڑتا تھا۔ (اختلاف امت پر ایک نظر ملحقہ جواہر الفقہ ۱/۴۴۲)

اسلام میں مشورہ کی تکریم اور تاکید فرمانے کا یہی منشاء ہے کہ معاملہ کے متعلق مختلف پہلو اور مختلف آراء سامنے آجائیں تو فیصلہ بصیرت کے ساتھ کیا جاسکے، اگر اختلاف رائے مذموم سمجھا جائے تو مشورہ کا فائدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

(وحدت امت، جواہر الفقہ ۱/۳۹۸)

صحابہ و تابعین میں اختلاف رائے اور اس کا درجہ

انتظامی اور تجرباتی امور میں تو اختلاف رائے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کی مجلس میں بھی ہوتا رہا اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرامؓ کے عہد میں امور انتظامیہ کے علاوہ جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل پیش آئے جن کا قرآن و حدیث میں صراحت نہ تھی یا قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت سے یا ایک

مجتہدین میں چلے آئے ہیں۔ ان مسائل میں جو اختلافات صحابہ کرام میں پیش آچکے ہیں، ان کو مٹانے کے معنی اس کے سوا نہیں ہو سکتے کہ صحابہ کرام کی کسی ایک جماعت کو باطل پر قرار دیا جائے، جو نصوص حدیث اور ارشادات قرآنی کے بالکل خلاف ہے، اسی لیے حافظ شمس الدین ذہبی نے فرمایا ہے کہ جس مسئلے میں اختلاف صحابہ کرام کے درمیان ہو چکا ہے اس کو بالکل ختم کر دینا ممکن نہیں۔

اسی کے ساتھ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تعبیر کتاب و سنت کے ماتحت جو ان میں اختلاف رائے پیش آیا ہے اس پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ اس نے جنگ و جدال کی صورت اختیار کی ہو، باہمی اختلاف مسائل کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور تمام برادرانہ تعلقات قائم رہنا اس پوری تاریخ کا اعلیٰ شاہکار ہے۔

سیاسی مسائل میں مشاجرات صحابہ کا فتنہ، تکیوینی حکمتوں کے ماتحت پیش آیا، آپس میں تلواریں بھی چل گئیں، مگر عین اسی فتنہ کی ابتداء میں جب امام مظلوم حضرت عثمان غنیؓ باغیوں کے نزعے میں محصور تھے اور یہی باغی نمازوں میں امامت کرتے تھے تو امام مظلوم نے مسلمانوں کو ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی، اور عام ضابطہ یہ بتا دیا کہ:

”اذا هم احسنوا فاحسن معهم وإن هم أساوا فاجتنب

إساءتهم“۔

یعنی جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں اس میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور جب کوئی برا اور غلط کام کریں اس سے اجتناب کرو۔

اس ہدایت کے ذریعہ اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کو قرآنی ارشاد:

”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ کی صحیح تفسیر بتادی اور باہمی انتشار و افتراق کا دروازہ بند کر دیا۔

و یحرم هذا فلا يرى المحرم المحل هلك لتحليله ولا يرى المحل ان المحرم هلك لتحريمه . (جامع العلم)

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتوے دیتے رہے، ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے دوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حرام ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک ہو گیا۔ اسی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے فقیہ مدینہ حضرت قاسم بن محمدؓ سے ایک مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان دونوں آراء میں سے آپ جس پر عمل کر لیں کافی ہے کیونکہ دونوں طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا اسوہ موجود ہے۔

(جامع بیان العلم، وحدت امت ملحقہ جواہر الفقہ ۴۰۰/۱)

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت میں ایک چیز حلال ہو اور

دوسرے امام کے نزدیک حرام ہو؟

یہاں اصول دین اور اسباب اختلاف سے ناواقف لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلام میں ایک چیز حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو اور جائز بھی ہو، ناجائز بھی ہو؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک غلط اور ایک صحیح ہوگی، پھر دونوں جانب کا یکساں احترام کیسے باقی رہ سکتا ہے جس کو ایک آدمی غلط سمجھتا ہے اس کو غلط کہنا عین دیانت ہے؟

جواب یہ ہے کہ کلام مطلق حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں نہیں، کیونکہ قرآن

حدیث کا دوسری حدیث سے بظاہر تعارض نظر آیا اور ان کو قرآن و سنت کی نصوص میں غور کر کے تعارض کو رفع کرنے اور شرعی مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا تو ان میں اختلاف رائے ہوا، جس کا ہونا عقل و دیانت کی بناء پر ناگزیر تھا۔

اذان اور نماز جیسی عبادتیں جو دن میں پانچ مرتبہ میناروں اور مسجدوں میں ادا کی جاتی ہیں۔ ان کی بھی جزوی کیفیات میں اس مقدس گروہ کے افراد کا خاصا اختلاف نظر آتا ہے اور اس کے اختلاف رائے پر باہمی بحث و مباحثہ میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

ایسے ہی غیر منصوص یا مبہم معاملات حلال و حرام، جائز و ناجائز میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شاگرد حضرات تابعین کا یہ عمل بھی ہر اہل علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کر لیتی تھی اور کوئی ان کے بالمقابل دوسری جماعت دوسرے صحابی کی رائے پر عمل کرتی تھی، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کے اس پورے خیر القرون میں اس کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے پیروؤں میں کہیں ایک واقعہ بھی اس کا سننے میں نہیں آیا کہ ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق کہتے ہوں یا کوئی مخالف فرقہ اور گروہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء کرنے سے روکتے ہوں یا کوئی مسجد میں آنے والا لوگوں سے یہ پوچھ رہا ہو کہ یہاں کے امام اور مقتدیوں کا اذان و اقامت کے صیغوں، میں قرأت فاتحہ، رفع یدین وغیرہ میں کیا مسلک ہے، ان اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل یا سب و شتم، توہین، استہزاء اور فقرہ بازی کا تو ان مقدس زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

امام ابن عبد البر قرطبی نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں سلف کے باہمی اختلافات کا حال الفاظ ذیل میں بیان کیا ہے:

عن یحییٰ بن سعید قال ما برح اهل الفتوى يفتون فيحل هذا

پالیں وہ ہر حیثیت سے کامیاب اور دہرے اجر کے مستحق ہیں، اور جو مقدور بھر کوشش کے اس حد تک نہ پہنچے تو معذور ہیں، ان پر کوئی ملامت نہیں بلکہ ان کے سعی و عمل کا ایک اجر ان کو بھی ملتا ہے۔ (جواہر الفقہ ۴۰۲/۱، رسالہ وحدت امت)

انبیاء علیہم السلام کے درمیان اجتہادی اختلاف

مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا إِلَّا تَتَّبِعَنِ۔ (سورہ طہ، پ ۱۶)

(حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا قصہ معروف ہے) اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اس حالت میں ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اس مشرک قوم کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے تھا، ان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ جاتے جس سے ان کے عمل سے مکمل بیزاری کا اظہار ہو جاتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور تفرقہ قائم ہو جائے گا، اور چونکہ ان کی اصلاح کا یہ احتمال موجود تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد ان کے اثر سے پھر یہ سب ایمان اور توحید کی طرف لوٹ آئیں اس لیے کچھ دنوں کے لیے ان کے ساتھ مسابہت اور مساکنت کو ان کی اصلاح کی توقع تک گوارہ کیا جائے۔ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور ایمان و توحید پر لوگوں کو قائم کرنا تھا۔ مگر ایک نے مفارقت اور مقاطعت کو اس کی تدبیر سمجھا، دوسرے نے اصلاح حال کی امید تک ان کے ساتھ مسابہت اور نرمی کے معاملہ کو اس مقصد کے لیے نافع سمجھا، دونوں جانب اہل عقل و فہم اور فکر و نظر کے لیے محل غور و فکر ہیں، کسی کو خطا کہنا آسان نہیں۔

مجتہدین امت کے اجتہادی اختلافات عموماً اسی طرح کے ہوتے ہیں ان میں سے کسی کو گنہگار یا نافرمان نہیں کہا جاسکتا۔ (معارف القرآن ۱۳۵/۶، ط)

سنت کے منصوصات اور تصریحات کے اعتبار سے کچھ چیزیں واضح طور پر حرام ہیں، جیسے سود، شراب، جوا، رشوت وغیرہ، ان میں دورائیں نہیں ہو سکتی اور نہ سلف صالحین کا ان میں کہیں اختلاف ہو سکتا تھا، اور ان میں اختلاف کرنا تو دین کے بینات اور واضح نصوص کا انکار کرنا ہے جو باتفاق امت گمراہی اور الحاد ہے، اور جو ایسا کرے اس سے بیزاری اور برأت کا اعلان کرنا عین تقاضائے ایمان ہے، اس میں رواداری ممنوع ہے۔

یہ رواداری کی تلقین اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے مخالف رائے کا احترام صرف ایسے مسائل میں ہے جو یا تو قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں یا مذکور ہیں، مگر ایسے اجمال و ابہام کے ساتھ کہ ان کی تشریح و تفسیر کے بغیر ان پر عمل نہیں ہو سکتا یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر کچھ تعارض نظر آتا ہے، ان سب صورتوں میں مجتہد عالم کو قرآن و سنت کے نصوص میں مقدور بھر غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا منشا اور مفہوم کیا ہے اور اس سے کیا احکام نکلتے ہیں، اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک عالم مجتہد اصول اجتہاد کے مطابق قرآن و سنت اور تعامل صحابہ وغیرہ میں غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے کے فلاں کام جائز ہے، اور دوسرا عالم مجتہدان ہی اصولوں میں پورا غور و فکر کر کے اس کے ناجائز ہونے کو صحیح سمجھے، ایسی صورت میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب کے مستحق ہیں، کسی پر کوئی عتاب نہیں، جس کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے، اس کو دو ہر اجر و ثواب اور جس کی صحیح نہیں اس کو ایک اجر ملے گا، اسی سے بعض اہل علم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اجتہادی اختلافات میں دونوں متضاد قول حق و صحیح ہوتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں تمام احکام عبادات و معاملات سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کوئی خاص کام نہیں، بلکہ بندوں کی اطاعت شعاری کا امتحان ہے، جب دونوں نے اپنی اپنی غور و فکر اور قوت اجتہاد شرائط کے ساتھ خرچ کر لی، تو دونوں اپنا فرض ادا کر چکے، دونوں صحیح جواب ہیں، مگر جمہور امت اور ائمہ مجتہدین کی تحقیق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ان دونوں میں سے کوئی ایک حق و صحیح ہوتا ہے تو جو لوگ اپنے اجتہاد سے اس حق کو

صحابہ کے درمیان اجتہادی اختلاف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اعلان کرنے کے لیے ایک منادی کو بھیج دیا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم لوگوں کو سنایا لا یصلین احد العصر الا فسی بنی قریظہ ”یعنی کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنو قریظہ میں نہ پہنچ جائے، صحابہ کرام سب کے سب اس دوسرے جہاد کے لیے فوراً تیار ہو کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں عصر کا وقت آیا تو بعض حضرات نے حکم نبوی کے ظاہر کے موافق راستہ میں نماز عصر ادا نہیں کی بلکہ منزل مقرر بنو قریظہ میں پہنچ کر ادا کی۔ اور بعض نے یہ سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد عصر کے وقت میں بنو قریظہ پہنچ جانا ہے، ہم اگر نماز راستہ میں پڑھ کر عصر کے وقت میں پہنچ جائیں تو یہ حضور کے منافی نہیں، انہوں نے نماز عصر اپنے وقت پر راستہ میں ادا کر لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کے اس اختلاف عمل کی خبر دی گئی، تو آپ نے دونوں فریق میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی، بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی، اس سے علماء امت نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ علماء مجتہدین جو حقیقت مجتہد ہوں اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کے اقوال مختلفہ میں سے کسی کو گناہ اور منکر نہیں کہا جاسکتا دونوں فریقوں کے لیے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں ثواب لکھا جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۷/۱۱۷)

اختلاف محمود اور مذموم

آیت: ”وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً“ میں یہ ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی امت و ملت بنا دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبول اسلام پر مجبور

کر ڈالتے، سب کے سب مسلمان ہی ہو جاتے، ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا، مگر بتقاضائے حکمت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اس نے انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کر دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دین حق اور تعلیم انبیاء کی مخالفت ہے۔ اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہائے اسلام میں ہونا ناگزیر ہے اور عہد صحابہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ وہ اس میں داخل نہیں۔ نہ وہ رحمت الہی کے خلاف ہے، بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کے اختلافات کو اس آیت کی رو سے غلط خلاف رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاق آیت کے بھی خلاف ہے۔ اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی، واللہ اعلم۔ (معارف القرآن ۴/۶۸۰، ہود)

اختلاف حق اور اختلاف رحمت کا معیار

اختلاف رائے جو اپنے حدود کے اندر ہو یعنی قرآن و سنت کے قطعی اور اعتقادی مسائل اور قطعی احکام میں نہ ہو صرف فروعی مسائل اجتہادیہ میں ہو، جن میں قرآن و سنت کی نصوص ساکت یا مبہم (یا متعارض) ہیں اور وہ بھی جنگ و جدل اور لعن و طعن کی حد تک نہ پہنچے تو وہ بجائے مضر ہونے کے مفید اور ایک نعمت و رحمت ہے۔

جیسے کائنات عالم کی تمام چیزوں کی شکل و صورت، رنگ و بو اور خاصیت و منفعت میں اختلاف ہے، حیوانات میں لاکھوں مختلف قسمیں، بنی نوع انسان ہیں، مزاجوں اور پیشوں، صنعتوں اور رہن سہن کے طریقوں میں اختلاف، یہ سب اس عالم کی رونق بڑھانے والے اور بے شمار منافع کے اسباب ہیں۔ (معارف القرآن ۳/۳۶۵، انعام)

اجتہادی اختلاف کی مثال

اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے

صحابہ و تابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ ایک دوسرے پر فاسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں۔ بحث و تحقیق اور مناظرے و مکالمے سب کچھ ہوتے تھے اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجہ بیان کرتا اور دوسرے پر اعتراض کرتا تھا لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گنہگار نہ سمجھتا تھا۔ (معارف القرآن ۲۵/۳، مائدہ)

یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں اور جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں ان کو دوسروں کے نزدیک گنہگار کہنا جائز نہیں۔

ائمہ مجتہدین اور فقہاء مذاہب کے اختلاف کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ ایک مجتہد نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس کے نزدیک رائج ہے، مگر اس کے مقابل دوسرے مجتہد کے فقہاء صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کے بے شمار حالات اور واقعات اس پر شاہد ہیں کہ فقہی مسلک بہت سے مسائل میں مختلف ہونے اور علمی بحثیں جاری رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل اعتقاد و احترام کرتے تھے، جنگ و جدل اور خصومت و عداوت کا وہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مذاہب فقہاء کے متبعین اور مقلدین میں بھی جہاں تک صحیح علم و دیانت رہے ان کے بھی باہمی معاملات ایسے ہی رہے۔

(معارف القرآن ۳۶/۳، انعام)

منکر و معروف کی تعریف

لفظ معروف معروف ہے اور منکر انکار سے ماخوذ ہے، معروف کہتے ہیں کسی چیز کو غور و فکر کر کے سمجھنے یا پہچاننے کو، اس کے بالمقابل انکار کہتے ہیں نہ سمجھنے یا نہ پہچاننے کو، یہ دونوں لفظ متقابل سمجھے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے: ”يَعْرِفُونَ“

والوں کی آسانی کے لیے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام۔ اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کے لیے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے۔ ایک روڈ کے کئی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے مگر چونکہ سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور ہر ایک پر چلنے والا ایک ہی منزل مقصود پر پہنچے گا، اس لیے راستوں کا یہ اختلاف بجائے مضر ہونے کے مفید اور چلنے والوں کے لیے وسعت و رحمت ہے۔

(معارف القرآن ۳۶/۳-۳۶/۴، انعام)

مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک جانب کو باطل سمجھنا یا اس پر نکیر کرنا درست نہیں

”مَا قَطَعْتُمْ مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ“ (سورہ حشر، پ ۲۸)

دوسرا اہم اصول اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ اجتہاد شرعی کی صلاحیت رکھتے ہیں اگر ان کا اجتہاد کسی مسئلہ میں مختلف ہو جائے ایک فریق جائز قرار دے اور دوسرا ناجائز تو عند اللہ یہ دونوں حکم درست اور جائز ہوتے ہیں ان میں سے کسی کو گناہ و معصیت نہیں کہہ سکتے اور اس لیے ان پر نہی عن المنکر کا قانون جاری نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں سے کوئی جانب بھی منکر شرعی نہیں۔ (معارف القرآن ۳۶/۲۸، حشر)

مجتہدین جن کی شان اجتہادی علماء امت میں مسلم ہے اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں ایسے مسائل میں ایک رائے کو رائج سمجھنے والے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے، جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ

تھا، لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گھنگار نہ سمجھتا تھا۔

(معارف القرآن ۲۵۲/۳، مائدہ پ ۵)

اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود

اہل علم کی سخت غلطی اور اس کا نقصان

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر یہ تو ہر ذی علم کو اختیار ہے کہ جس جانب کو رائج سمجھے اسے اختیار کرے لیکن دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اس پر انکار کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے اس سے واضح ہوا کہ اجتہادی مسائل میں جنگ و جدل یا منافرت پھیلانے والے مقالات و مضامین امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل نہیں ان مسائل کو محاذ جنگ بنانا صرف ناواقفیت یا جہالت (اور ضد و تعصب) ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (معارف القرآن ۲۵۳/۳، مائدہ)

یہ وہ بات ہے جس میں آج کل بہت سے اہل علم بھی غفلت میں مبتلا ہیں، اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرا اور سب و شتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے جس کا نتیجہ مسلمانوں میں جنگ و جدل اور انتشار و اختلاف کی صورت میں جگہ جگہ مشاہدہ میں آ رہا ہے، اجتہادی اختلاف بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ تو ہرگز آیت مذکور ”وَلَا تَفْرَقُوا“ کے خلاف اور مذموم نہیں۔ البتہ اس اجتہادی اختلاف کے ساتھ جو معاملہ آج کل کیا جا رہا ہے کہ اسی کے بحث و مباحثہ کو دین کی بنیاد بنائی گئی اور اس پر باہمی جنگ و جدل اور سب و شتم تک نوبت پہنچادی گئی یہ طرز عمل بلاشبہ ”وَلَا تَفْرَقُوا“ کی کھلی مخالفت اور مذموم اور سنت سلف صحابہ و تابعین کے بالکل خلاف ہے، اسلاف امت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلاف کی بنا پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو، مثلاً امام شافعی اور دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز جماعت کے ساتھ

نِعْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُ وُثْنَهَا“ یعنی اللہ کی قدرت کاملہ کے مظاہر دیکھ کر اس کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں مگر پھر از روئے عناد انکار کرتے ہیں، گویا ان نعمتوں کو جانتے نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لغوی معنی کے اعتبار سے معروف کے معنی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، اور منکر کے معنی نا پہچانی ہوئی چیز کے، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اسی کی مناسبت سے اصطلاح شرع میں معروف و منکر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ معروف ہر اس فعل کو کہا جاتا ہے جس کا مستحسن یعنی اچھا ہونا عقل یا شرع سے پہچانا ہوا ہو، اور منکر ہر اس فعل کا نام ہے جو از روئے عقل و شرع اوپر اور نہ پہچانا ہوا ہو، یعنی برا سمجھا جاتا ہو، اس لیے امر بالمعروف کے معنی اچھے کام کی طرف بلانے کے اور نہی عن المنکر کے معنی برے کام سے روکنے کے ہو گئے۔

ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں کوئی منکر شرعی نہیں ہوتا

لیکن اس جگہ گناہ و ثواب یا طاعت و معصیت کے بجائے معروف و منکر کا لفظ استعمال کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ وہ دقیق اور اجتہادی مسائل جن میں قرآن و سنت کے اجمال یا ابہام کی وجہ سے دورائیں ہو سکتی ہیں، اور اسی بناء پر ان میں فقہاء امت کے اقوال مختلف ہیں، وہ اس دائرہ سے خارج ہیں ائمہ مجتہدین جن کی شان اجتہاد علماء امت میں مسلم ہے، اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں ایسے مسائل میں ایک رائے کو رائج سمجھنے والے کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے، جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ وہ ایک دوسرے پر فاسق یا گھنگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں بحث و تحقیق اور مناظرے و مکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجہ بیان کرتا اور دوسرے پر اعتراض کرتا

بحث بھی کی ہے کہ ہر مجتہد ہمیشہ مصیب ہی ہوتا ہے اور دو متضاد اجتہاد ہوں تو دونوں کو حق سمجھا جائے گا، یا ان میں سے ایک فیصلہ کو خطا اور غلط قرار دیا جائے گا؟ اس میں قدیم زمانہ سے علماء کے مختلف اقوال ہیں، آیت مذکورہ سے دونوں جماعتوں نے استدلال کیا ہے، جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ دونوں اجتہاد حق ہیں، اگرچہ متضاد ہوں ان کا استدلال آیت کے آخری جملے سے ہے جس میں فرمایا: ”وَكُلًّا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا“ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام پر کوئی عتاب نہیں ہے نہ ان کو یہ کہا گیا کہ ان سے غلطی ہوگئی، اس سے معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی حق تھا اور سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ بھی۔ البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو فریقین کے صلح ہونے کی بنا پر ترجیح دے دی گئی۔

اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اختلاف اجتہادی کے مواقع میں حق ایک طرف ہوتا ہے دوسرا غلط ہوتا ہے ان کا استدلال اسی آیت کے پہلے جملہ یعنی ”فَفَهْمْنَاهَا“ سے ہے کہ اس میں تخصیص کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو حق فیصلہ سمجھا دیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ حق نہ تھا گو وہ بوجہ اپنے اجتہاد کے اس میں معذور ہوں، اور ان سے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو۔ یہ بحث اصول فقہ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئی ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ حدیث میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اجتہاد کیا اور کوئی حکم دینی اصول اجتہاد کے ماتحت بیان کیا، اگر اس کا اجتہاد صحیح ہوا تو اس کو دو اجر ملیں گے ایک اجر اجتہاد کرنے کی محنت کا، دوسرا اجر جو اصل حکم صحیح تک پہنچنے کا تھا وہ نہ ملے گا۔ (یہ حدیث اکثر مستند کتب حدیث میں منقول ہے)۔

اس حدیث سے اس اختلاف علماء کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت یہ اختلاف ایک نزاع لفظی جیسا ہے کیونکہ حق دونوں طرف ہونے کا حاصل یہ ہے کہ

امام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، اور ظاہر ہے کہ جو اس فرض کو ادا نہیں کرے گا اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہوگی۔ اس کے بالمقابل امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں۔ اسی لیے حنفیہ نہیں پڑھتے، لیکن پوری امت کی تاریخ میں کسی سے نہیں سنا گیا کہ شافعی مذہب والے حنفیوں کو تارک نماز کہتے ہوں کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں۔ اس لیے تم بے نمازی ہو، یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکرات شرعیہ پر کی جاتی ہے۔

امام ابن عبد البرؒ اپنی کتاب جامع العلم میں اس معاملہ کے متعلق سنت سلف کے بارے میں یہ بیان فرماتے ہیں:

عن يحيى بن سعيد قال ما برح اهل الفتوى يفتون فيحل هذا ويحرم هذا فلا يرى المحرم ان المحل هلك لتحليله ولا يرى المحل ان المحرم هلك لتحريمه. (جامع بيان العلم ص: ۸۰)

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتویٰ دیتے رہتے ہیں ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو اپنے اجتہاد سے حلال قرار دیتا ہے، دوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک اور گمراہ ہو گیا۔

(معارف القرآن ۲/۱۴۴، آل عمران)

دو مجتہد اگر اپنے اجتہاد سے دو متضاد فیصلے کریں تو کیا ان میں سے ہر ایک صواب اور درست ہے یا کسی ایک کو غلط کہا جائے

فَفَهْمْنَاهَا سُلَيْمَنَ. الْآيَةُ. (انبیاء)

اس موقع پر قرطبی نے بڑی تفصیل سے اور دوسرے مفسرین نے مفصل یا مختصر یہ

صواب ہے مگر احتمال خطا کا بھی ہے اور دوسری جانب خطا ہے مگر احتمال صواب کا بھی ہے۔ اور وہ یہ بات ہے جو تمام ائمہ فقہاء میں مسلم ہے۔ اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر خود امر منکر ہے، اس سے پرہیز لازم ہے۔

(معارف القرآن ۱۲۳۶ء، آل عمران)

دوسرے مسلک کے مقابلہ میں اپنے مسلک کی ترجیح دینے

سے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا اہم ارشاد

ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی، قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے، ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا، ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سرپکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں، میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں! ٹھیک ہی ہے میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی۔

میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں، جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟

فرمایا: ”میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کر دی۔“

میں نے عرض کیا ”حضرت بات کیا ہے؟“

فرمایا: ”ہماری عمر کا ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے

اجتہاد میں خطا کرنے والے مجتہد اور اس کے متبعین کے لیے بھی اجتہاد حق و صحیح ہے۔ اس پر عمل کرنے سے اس کی نجات ہو جائی گی خواہ یہ اجتہاد اپنی ذات میں خطا ہی ہو مگر اس پر عمل کرنے والوں کو کوئی گناہ نہیں۔

اور جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ حق ان دونوں میں ایک ہی ہے دوسرا غلط اور خطا ہے اس کا حاصل بھی اس سے زیادہ نہیں کہ اصل مراد حق تعالیٰ اور مطلوب خداوندی تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اس مجتہد کے ثواب میں کمی آجائے گی، اور یہ کمی اس وجہ سے ہے کہ اس کا اجتہاد حق بات تک نہ پہنچا۔ لیکن یہ مطلب ان کا بھی نہیں ہے کہ مجتہد خاطی پر کوئی ملامت ہوگی یا اس کے متبعین کو گھنگا رکھا جائے گا۔ تفسیر قرطبی میں اس مقام پر ان تمام مباحث کو پوری تفصیل سے لکھا ہے اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

(معارف القرآن ۲۱۰۶، انبیاء)

مجتہد فیہ مسائل میں کسی مذہب کو یقینی طور سے صواب یا خطا

کا فیصلہ کر دینے کا حق کسی کو نہیں

یہاں سے ایک بہت اہم اصولی بات واضح ہوگئی کہ جو اجتہادی اختلاف شرعی اجتہاد کی تعریف میں داخل ہے اس میں اپنے اپنے اجتہاد سے جس امام نے جو جانب اختیار کر لی اگرچہ عند اللہ اس میں صواب اور صحیح صرف ایک ہے، دوسرا خطا ہے لیکن یہ صواب و خطا کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد و صواب پر پہنچنے والے عالم کو دودھرا ثواب عطا فرمائیں گے اور جس کے اجتہاد نے خطا کی ہے اس کو ایک ثواب دیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے دوسرا غلط ہے۔ ہاں اپنی فہم و بصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب الی القرآن والسنہ سمجھے اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ

”اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو، نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلا دیا ہے جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا۔“

کسی مسلک کی ترجیح کے بجائے متفق علیہ معروفات کو

پھیلانے اور منکرات کو مٹانے کی محنت کیجئے

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوت صرف کر دی، اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، جمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیائے کرام لے کر آئے تھے جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی، یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں، اور اپنے وغیرا ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہئے تھا وہ پھیل رہے ہیں، اور گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے شرک و بت پرستی چل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے لیکن ہم لگے ہوتے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

”یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔“

کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں، امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں، اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔“

اور امام شافعیؒ، مالکؒ، اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسلک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطاء (درست مسلک جس میں خطاء کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں، اور دوسرے کے مسلک کو ”خطاء محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں پھر فرمایا:

”ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا، اور کون سا خطاء، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطاء ہو، اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آئین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی؟ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔“

اللہ تعالیٰ کسی امام و مجتہد کو قیامت میں رسوا نہ کرے گا

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:

ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ (حاشیہ از مرتب)

☆ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فرمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ضرورت کے موقعوں پر بھی مسلک کی ترجیح ثابت نہ کی جائے، بلاشبہ بعض حالات اور بعض مواقع ایسے بھی آ جاتے ہیں کہ فتنہ پرور لوگ سیدھے سادے دیندار مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر کے فتنہ کا نیا دروازہ کھول دیتے ہیں، مثلاً حضرت امام ابو حنیفہؒ کی شخصیت کو مجروح کرتے ہیں کہ ان کو حدیثوں کا علم نہ تھا، صرف ۷۱ حدیثیں ان کو یاد تھیں، حدیثوں کے مقابلہ میں وہ قیاس اور رائے سے کام لیتے تھے، فلاں فلاں مسئلہ حنفی مسلک میں (مثلاً عدم رفع یدین، آمین بالسر وغیرہ مشہور مسئلے) حدیث پاک کے خلاف ہیں، حنفی مسلک حدیث کے خلاف ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کے حالات میں جب کہ امام ابو حنیفہؒ کی شخصیت کو متہم اور مجروح کیا جا رہا ہو، ان کے مدون کردہ فقہ کو بے بنیاد اور حدیث پاک کے خلاف قرار دیا جا رہا ہو، جو کہ بالکل واقع کے خلاف ہے، ایسی صورت میں واقعی ضرورت پیش آتی ہے کہ ائمہ مجتہدین کی طرف سے دفاع کیا جائے، ان کے مدون کردہ فقہ کی حفاظت کی جائے، اور اس کے نشر و اشاعت کی کوشش کی جائے، ایسا کرنا خود جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مقتضی ہے۔

بخاری شریف میں میں 'باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحة للہ ولرسولہ ولأئمة المسلمین'۔ (بخاری شریف باب ۴۲، حدیث ص: ۵۷)

یعنی دین نام ہے خیر خواہی اور ادائے حقوق کا، اللہ کے لیے اس کے رسول کے لیے اور ائمہ المسلمین کے لیے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ تمیم داری فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ خیر خواہی کس کے لیے؟ آپ نے فرمایا اللہ ولکتابہ ولرسولہ ولأئمة المسلمین یعنی دین نام ہے اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کے ساتھ خیر خواہی اور ادائے حقوق کا، اسی طرح دین نام ہے ائمہ المسلمین کے ساتھ خیر خواہی کرنے کا۔

اس حدیث کی شرح میں شارح بخاری حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں:

ومن جملة ائمة المسلمين ائمة الاجتهاد، وتقع النصيحة لهم ببث علومهم ونشر مناقبهم وتحسين الظن بهم۔ (فتح الباری ۱/۱۸۲، فتح الملہم ۱۵۲)

یعنی ائمہ المسلمین کے ساتھ خیر خواہی میں ائمہ مجتہدین بھی شامل ہیں اور ائمہ مجتہدین کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے مدون کردہ علوم کو عام کیا جائے، ان کے فضائل و مناقب کو پھیلایا جائے اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے۔

لہذا ایسے حالات اور ایسے ماحول میں جب کہ امام ابو حنیفہؒ یا ائمہ مجتہدین میں سے کسی امام پر مختلف قسم کے الزامات لگائے جا رہے ہوں، ان کی شخصیت کو مجروح ان کے مدون کردہ فقہ اور ان کے مسلک کو غیر معتد کہا جا رہا ہو اور ان کے خلاف فضا بنائی جا رہی ہو ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب اور حافظ ابن حجرؒ کی تشریح کے مطابق ضروری ہوگا کہ امام و مجتہد کے فضائل و مناقب بیان کئے جائیں، ان کے علوم کی حفاظت کی جائے، ان کو عام کیا جائے، اور ائمہ مجتہدین کی حمایت میں مخالفین و معترضین کو جواب دیا جائے، اور یہ سارا کام محض للہیت اور اخلاص کے ساتھ حدیث پاک پر عمل کرنے کے جذبہ سے کیا جائے تو یقیناً یہ جدوجہد بھی رایگاں نہیں جائے گی بلکہ باعث اجر و ثواب ہوگی۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من حمى مومنا من منافق بعث الله ملكا يحمى لحمه يوم القيامة من نار جهنم، ومن رمى مسلماً بشئ يريده شينه به حسبه الله على جسر جهنم حتى يخرج مما قال۔

(ابو داؤد شریف کتاب الادب باب الرجل يذب عن عرض اخيه ص ۶۶۹)

جو کسی مومن کی کسی منافق (بدگو) کی بدزبانی سے حفاظت اور اس کی حمایت کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت میں ایک فرشتہ مقرر کرے گا جو اس کے جسم کی نار جہنم سے حفاظت کرے گا اور جو کسی مسلمان کو عیب لگائے گا، نکتہ چینی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اس کی وجہ سے جہنم کے پل پر روک دے گا جب تک کہ اپنے کئے اور کہے ہوئے کی سزا نہ بھگت لے۔

نیز ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما من امرئ يخذل امرأ مسلماً في موضع ينتهك فيه حرمة وينتقص فيه

اجتہادی اختلاف سلف صالحین کی نظر میں

علمی مسائل میں جھگڑا نورِ علم کو ضائع کر دیتا ہے

ایسے ہی اختلاف کے متعلق جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دورائیں ہوں امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا:

أحد القولین خطاء والمائم فیہ موضوع. (جامع بیان العلم لابن عبد البر ۸۳/۲)
متضاد اقوال میں سے ایک خطا ہے مگر اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے۔
دلائل سے ثابت کیا ہے کہ کسی امام و مجتہد کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے حدیث پاک کے خلاف مسلک کو اختیار کیا ہے اس کے وجوہات اور اسباب تفصیل سے لکھے ہیں۔

(ملاحظہ ہو ”رفع الملام عن الأئمة الاعلام“ فتاویٰ ابن تیمیہ)
اور امام مالکؒ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا:

خطاء وصواب فانظر فی ذلک۔ (جامع بیان العلم)

= اسی طرح بہت سے سوانح نگاروں نے یہ خدمت انجام دی ہے کہ علمائے و مشائخ پر لگائے گئے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک رسالہ اسی غرض سے لکھا ہے ”النسۃ الجلیلیۃ فی الاچتہات العلیۃ“ اس کا مقصد بھی یہی ہے، لہذا اگر بزرگان دین اور ائمہ مجتہدین پر اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کی شخصیت کو مجروح کیا جاتا ہے، ان کے مسلک کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کی جاتی ہے، تو ایسے موقع پر حمایت کرنا، شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق بڑی خدمت ہوگی اور باعث اجر و ثواب بھی ہوگا بشرطیکہ حدود کے اندر ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو۔ واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه۔

(ابوداؤد)

من عرضه الا خذله اللہ فی موطن یحب فیہ نصرته.

وما من امرئ ینصر مسلماً فی موضع ینتقص فیہ من عرضه وینتھک فیہ من حرمتہ الا نصرہ اللہ فی موطن یحب نصرته.

(ابو داؤد باب الرجل یذب عن عرض اخیه ص: ۶۶۹)
جو شخص کسی مرد مسلم کی حمایت و نصرت ایسے موقع پر چھوڑ دے گا جب کہ اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو، اس کی تنقیص و توہین کی جا رہی ہو، ایسے موقع پر جو کسی مسلمان کا ساتھ چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کو ایسے وقت میں چھوڑ دے گا جب کہ وہ نصرت کا محتاج ہوگا۔
اور جو شخص کسی مسلمان کی نصرت و حمایت کرے گا ایسے موقع پر جب اس کی تنقیص و توہین کی جا رہی ہو اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نصرت و حمایت ایسے موقع پر کرے گا جب کہ وہ نصرت کو پسند کرتا ہوگا۔

فائدہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے اندازہ لگانا چاہئے کہ جب عام مسلمان جس پر خواہ مخواہ کے الزامات لگتے جا رہے ہوں، اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو اس کی حمایت و نصرت نہ کرنے کا یہ نقصان ہوگا، کہ اللہ بھی اس کی نصرت کو چھوڑے گا، تو ائمہ مجتہدین اور علماء و مشائخ دین پر اگر ہتھتیں اور الزامات لگائے جائیں ان کی تنقیص و توہین کی جائے اور ان کی حمایت و نصرت کو چھوڑ دیا جائے تو کس قدر عظیم خسارہ ہوگا اور اللہ کی نصرت سے محرومی کا باعث ہوگا، اسی طرح اگر کوئی عام مرد مومن کی نصرت و حمایت کرے یعنی اس کی طرف سے دفاع کرے جب کہ اس کی عزت پر حملہ کئے جا رہے ہوں تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نصرت و حمایت کرے گا ایسے وقت میں جب کہ وہ اس کا بہت محتاج ہوگا، تو اگر ائمہ مجتہدین و مشائخ دین پر لگائے جانے الزامات کا دفاع کیا جائے اور ان کی حمایت و نصرت کی جائے تو کس قدر اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت کا استحقاق ہوگا۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ کبار علماء محققین نے ائمہ اعلام، ائمہ مجتہدین کی طرف سے دفاع کیا ہے، ان پر لگائے ہوئے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں، مثلاً شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک رسالہ ہی تحریر فرمایا ہے، جس کا نام سے ”رفع الملام عن الأئمة الاعلام“ جس میں انہوں نے ائمہ مجتہدین پر لگائے جانے والے اعتراضات کے جوابات لکھے ہیں، اور =

میں باہمی اختلاف ہو رہا تھا حضرت فاروق اعظمؓ نے سنا تو غضبناک ہو کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ افسوس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں ایسے دو شخص باہم جھگڑ رہے ہیں جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں، اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں، پھر ان دونوں کے اختلاف کا فیصلہ اس طرح فرمایا کہ:

صدق أبی ولم یال ابن مسعود

یعنی صحیح بات تو ابی ابن کعب کی ہے مگر اجتہاد میں کوتاہی ابن مسعود نے بھی نہیں کی۔
پھر فرمایا کہ مگر میں آئندہ ایسے مسائل میں جھگڑا کرتا ہوں کسی کو نہ دیکھوں، ورنہ اتنی سزا دوں گا۔ (جامع العلم ۸۴۲)

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ اجتہادی مسائل و اختلافات میں ایک قول صواب و صحیح ہوتا ہے اور دوسرا اگرچہ صواب نہیں مگر ملامت اس پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے اجتہادی مسائل میں خلاف و اختلاف پر زیادہ زور دینا مقتدیانِ اہل علم کے لیے مناسب نہیں جس سے ایک دوسرے پر ملامت یا نزاع و جدال کے خطرات پیدا ہو جائیں۔

امام شافعیؒ کے ایک مفصل کلام نقل کر کے ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ کے اس کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ مجتہدین کو آپس میں ایک دوسرے کا تخطیہ نہ کرنا چاہئے، یعنی ان میں کوئی دوسرے کو یہ نہ کہے کہ آپ غلطی اور خطا پر ہیں۔ (جامع العلم ۷۳۲)
وجہ یہ ہے کہ ایسے اجتہادی مسائل میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے قول کو یقینی طور پر صواب و صحیح اور دوسرے کے قول کو یقینی طور پر خطا و غلط کہہ سکے، اجتہاد اور پورے غور و فکر کے بعد بھی جو رائے قائم کی ہے اس کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کا کسی کو حق نہیں کہ رائے صحیح و صواب ہے مگر احتمال خطا اور غلطی کا بھی ہے اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے کا قول صحیح و صواب ہو۔

ان میں بعض خطا ہیں بعض صواب و صحیح تو عمل کرنے والے اہل اجتہاد کو غور کر کے کوئی جانب متعین کرنا چاہئے۔

امام مالکؒ نے اپنے اس ارشاد میں جس طرح یہ واضح کر دیا کہ اختلاف اجتہادی میں ایک جانب صواب و صحیح اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے، دونوں متضاد چیزیں صواب نہیں ہوتیں، اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس اختلاف خطا و دونوں میں باہم جھگڑا اور جدل جائز نہیں، صرف اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھتا ہے اس کو نرمی اور خیر خواہی سے خطا پر متنبہ کر دے، پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت کرے جدال اور جھگڑا یا بدگوئی نہ کرے، حضرت امام کے ارشاد کا پورا متن یہ ہے:

کان مالک یقول المراء والجدال فی العلم یذهب بنور العلم من قلب العبد، وقیل له رجل له علم بالسنة فهو یجادل عنها قال ولكن لیخبر بالسنة فان قبل منه والا سکت.

(اوجز المسالک شرح موطأ مالک ۱۵/۱)

حضرت امام نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نور علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم حاصل ہے کیا وہ حفاظت سنت کے لیے جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا کہ نہیں بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح باب سے آگاہ کر دے پھر وہ قبول کرے تو بہتر ہے ورنہ سکوت اختیار کرے نزاع و جدال سے پرہیز کرے۔ (وحدت امت، جواہر الفقہ ۴۰۵/۱)

اجتہادی مسائل میں اختلاف و نزاع کی اور ایک دوسرے

کو خطا اور غلط کہنے کی ممانعت

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ میں ایک مسئلہ

اختلاف ہو گیا وہ اختلاف قیامت تک مٹایا نہیں جاسکتا کیونکہ اس اختلاف کے مٹانے کی ایک ہی صورت ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو قطعی طور پر حق پر اور دوسرے کو یقینی باطل قرار دیا جائے، اور یہ ممکن نہیں ہے۔ (وحدت امت، جواہر الفقہ ص: ۴۰۸)

ائمہ مجتہدین کے اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی

کسی مجتہد کو مجرم اور خطاوار کہنا جائز نہیں

مذکورۃ الصدر تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس مسئلہ میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن و سنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے اس لیے دونوں جانبیں داخل معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کوراج اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے، اس لیے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے، یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز و عدم جواز اور حرمت و حلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو جیسے منکرات پر کی جاتی ہے یا ایک دوسرے کو یا اس کے تبعین کو گمراہی یا فسق و فجور کی طرف منسوب کرتا ہو یا اس کو ترک وظیفہ یا ارتکاب حرام کا مجرم قرار دیتا ہو، حافظ ابن عبدالبر نے امام شافعیؒ کا جو قول نقل کیا ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطاوار مجرم کہنا جائز نہیں۔ (وحدت امت، جواہر الفقہ ص: ۴۰۹)

نااہل کے اجتہاد پر نکیر کرنا واجب ہے

حضرت امام شافعیؒ نے جہاں مجتہدین کے آپس میں ایک دوسرے کے تخطیہ کو

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلافات میں جمہور علماء کے نزدیک علم الہی کے اعتبار سے دو مختلف آراء میں سے حق تو کوئی ایک ہی ہوتی ہے مگر اس کا متعین کرنا کہ ان میں سے حق کیا ہے اس کا یقینی ذریعہ کسی کے پاس نہیں، دونوں طرف خطا و صواب کا احتمال دائر ہے، مجتہد اپنے غور و فکر سے کسی ایک جانب کو رائج قرار دے کر عمل کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔ (وحدت امت، جواہر الفقہ ص: ۴۰۷، ۴۰۸، مطبوعہ پاکستان)

اجتہادی اختلافات کے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا ارشاد

استاذ الاساتذہ سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اجتہادی مسائل اور ان کے اختلاف جن میں ہم اور عام اہل علم الجھتے رہتے ہیں اور علم کا پورا زور اس پر خرچ کرتے ہیں ان میں صحیح و غلط کا فیصلہ دنیا میں تو کیا ہوتا میرا گمان تو یہ ہے کہ محشر میں بھی اس کا اعلان نہیں ہوگا کیونکہ رب کریم نے جب دنیا میں کسی امام مجتہد کو باوجود خطا ہونے کے ایک اجر و ثواب سے نوازا ہے اور ان کی خطا پر پردہ ڈالا ہے تو اس کریم الکرماء کی رحمت سے بہت بعید ہے کہ وہ محشر میں اپنے ان مقبولان بارگاہ میں سے کسی کی خطا کا اعلان کر کے اس کو رسوا کریں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جن مسائل میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا نظری اختلاف ہوا ہے ان کا قطعی فیصلہ نہ یہاں ہوگا نہ آخرت میں، کیونکہ عمل کرنے والوں کے لیے ان میں سے ہر ایک کی رائے پر اپنی ترجیح کے مطابق عمل کر لینا جائز قرار دے دیا گیا ہے اور جس نے اس کے مطابق عمل کر لیا وہ فرض سے سبکدوش ہو گیا، اس کو باجماع امت تارک فرض نہیں کہا جاسکتا۔ ان مسائل میں کوئی عالم کتنی ہی تحقیقات کرے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی تحقیق کو یقینی حق و صواب کہا جائے اور اس کے مقابل کو باطل قرار دیا جائے۔

امام حدیث حافظ شمس الدینؒ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلہ میں صحابہ و تابعین کا

طور پر ایک جماعت بن جاتی ہے، اسی طرح دوسرے مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اگر جماعت بندی مثبت انداز میں صرف اجتہادی مسائل کی حد تک اپنی تعلیمی اور عملی آسانیوں کے لیے ہو تو نہ اس میں کوئی مضائقہ ہے نہ کوئی تفرقہ اور نہ ملت کے لیے اس میں مضرت۔

مضرت رساں اور تباہ کن ایک تو اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ و جدل اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں غلو کہ سارا علم و تحقیق کا زور اور بحث و تحقیق کی طاقت اور عمر کے اوقات عزیز انہی بحثوں کی نذر ہو جائیں، اگرچہ ایمان و اسلام کے بنیادی اور قطعی اجماعی مسائل مجروح ہو رہے ہوں، کفر و الحاد دنیا میں پھیل رہا ہو، سب سے صرف نظر کر کے ہمارا علمی مشغلہ یہی فروعی بحثیں بنی رہیں، جن کے متعلق مذکورۃ الصدر تفصیل میں ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان میں ہزار تحقیقات کے بعد بھی بات اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ یہ رائج ہے اور اس کے خلاف مرجوح اور اس رائج مرجوح کا بھی یقینی فیصلہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے نہ برزخ میں ان کا سوال ہوگا، نہ محشر میں اس رائج مرجوح کا اعلان ہوگا۔

اسی طرح نہ ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں پر نکیر کرنا درست ہے نہ ان کو خطا کا مجرم ٹھہرانا صحیح ہے، اس وقت ہماری قوم کا برگزیدہ ترین طبقہ علماء فقہاء کا خصوصاً جو تعلیم و تصنیف میں مشغول ہیں، ان کی شبانہ روز مشغولیت کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر حضرات کی علمی تحقیقات اور سعی و عمل کی ساری توانائی انہی فروعی بحثوں میں محدود نظر آئے گی۔

ان میں بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور ان کو تارک قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے کسی منکر اسلام کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو اور اسی کو دین کی

نا درست قرار دیا ہے وہیں اس کی معقول وجہ اور ایک شرط کا بھی ذکر کیا ہے ان کی عبارت کا متن یہ ہے:

وفی هذا من قول الشافعیؒ دلیل علی ترک تخطئة المجتہدین بعضهم لبعض اذ کل واحد منهم قد ادی ما کلف باجتہاده اذا کان ممن اجتمعت فیہ آلة القیاس وکان ممن له ان یجتہد ویقیس . (جامع العلم)

امام شافعیؒ کے کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ کوئی مجتہد دوسرے مجتہد کو خطا وار نہ قرار دے کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے وہ فرض ادا کر دیا جو اس کے ذی اس صورت میں ہے کہ اجتہاد صحیح اس کی شرائط کے مطابق ہو، آج کل کا سا جاہلانہ اجتہاد نہ ہو کہ جس کو عربی زبان بھی پوری نہیں آتی اور قرآن و حدیث سے اس کا رابطہ کبھی نہیں رہا، اردو، انگریزی ترجموں کے سہارے قرآن و حدیث پر مشق شروع کر دی، ایسا اجتہاد خود ایک گناہ عظیم ہے، اور اس سے پیدا ہونے والی رائے دوسرا گناہ اور گمراہی اور خلاف و شقاق ہے جس پر نکیر واجب ہے۔ (وحدت امت، جواہر الفقہ ۴۱/۱)

فروعی و اجتہادی مسائل میں غلو اور اس کی وجہ سے تعصب و تحزب

میرے نزدیک اس جنگ و جدل کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب و تعصب اور اپنی اختیار کردہ راہ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے جو اہل باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہئے تھا، اس پر تمام امت کا اتفاق بھی ہے اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے کہ جو لوگ خود درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام مجتہد کا اتباع کریں، اور جن لوگوں نے اپنے نفس کو آزادی اور ہوا پرستی سے روکنے کے لیے دینی مصلحت سمجھ کر کسی ایک امام مجتہد کا اتباع اختیار کر لیا ہے وہ قدرتی

ہے جو بچ نکلے۔

اسلام اور قرآن کا نام لینے والے مسلمان آج سارے جرائم اور بد اخلاقیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہمارے بازار جھوٹ، فریب، سود، قمار سے بھرے ہوئے ہیں، اور ان کے چلانے والے کوئی یہودی نہیں، ہندو بننے نہیں، اسلام کے نام لیوا ہیں، ہمارے سرکاری محکمے رشوت ظلم و جور، کام چوری، بے رحمی اور سخت دلی کی تربیت گاہیں بنے ہوئے ہیں، اور ان کے کارفرما بھی نہ انگریز ہیں، نہ ہندو، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لینے والے، روزِ آخرت پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والے ہیں، ہمارے عوام علم دین سے کورے، جہالتوں میں ڈوبے ہوئے، دین کے فرائض و واجبات سے بے گانہ، مشرکانہ رسوم اور کھیل تماشوں کے دلدادہ ہیں۔

ان حالات میں کیا ہم پر یہ واجب نہیں کہ ہم غور و فکر سے کام لیں، اور سوچیں کہ اس وقت ہمارے آقا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ اور توقع اہل علم سے کیا ہوگی؟ اور اگر محشر میں آپ نے ہم سے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر اس طرح کے حملے ہو رہے تھے، میری امت اس بد حالی میں مبتلا تھی، تم وراثت نبوت کے دعویدار کہاں تھے؟ تم نے اس وراثت کا کیا حق ادا کیا؟ تو کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم نے رفع یدین کے مسئلہ پر ایک کتاب لکھی تھی یا کچھ طلبہ کو شرح جامی کی بحث حاصل و محصول خوب سمجھائی تھی، یا حدیث میں آنے والے اجتہادی مسائل پر بڑی دلچسپ تقریریں کی تھیں، یا صحافیانہ زور قلم اور فقرہ بازی کے ذریعہ دوسرے علماء و فضلاء کو خوب ذلیل کیا تھا۔

فروعی اور اجتہادی مسائل میں بحث و تحقیص گونڈ موم چیز نہیں اگر وہ اپنی حد کے اندر اخلاص سے اللہ کے لیے ہوتی، لیکن جہاں ہم یہ دیکھ رہے ہوں کہ اسلام و ایمان کی بنیادیں متزلزل کر دینے والے فتنوں کی خبر ہم سنتے ہیں اللہ و رسول کے احکام کی خلاف روزی بلکہ استہزاء و تمسخر اپنے آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں مگر ہمارے

سب سے بڑی خدمت سمجھے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ یہ حضرات اسلام کی بنیادوں پر چاروں طرف سے حملہ آور طوفانوں سے باخبر نہیں یا جان بوجھ کر اغماض کرتے ہیں۔

(وحدت امت، جواہر الفقہ ۱/۴۱۲)

فروعی مسائل میں الجھنے کے بجائے باطل طاقتوں ملحدانہ فتنوں،

مشرکانہ رسموں سے مقابلہ میں اپنی صلاحیت اور توانائی صرف کیجئے

اس وقت جب کہ ایک طرف تو کھلے ہوئے کفر، عیسائیت اور کمیونزم نے پورے اسلامی ممالک اور اسلامی حلقوں پر گھیرا ڈالا ہوا ہے اور یہ دونوں کفر طوفانی رفتار کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں، صرف پاکستان میں ہزاروں کی تعداد ہر سال مرتد ہو جاتی ہے، دوسری طرف کفر، نفاق اور الحاد خود اسلام کا نام لینے والوں میں کہیں قادیانیت اور مرزائیت کے لباس میں، کہیں پرویزیت اور انکارِ حدیث کے عنوان سے کہیں مغرب سے لائی ہوئی اباحت اور تمام محرّمات شرعیہ کو حلال کرنے کے طریقوں سے ہمارے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، اور یہ الحاد، کفر و نفاق پہلے کفر سے اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ اسلام اور قرآن کے عنوان کے ساتھ آتا ہے جن کے دام میں سیدھے سادھے جاہل عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے ہمارے نو تعلیم یافتہ نوجوان بہ کثرت اس لیے آ جاتے ہیں کہ نئی تعلیم اور نئی معاشرت نے ان کو دینی تعلیم اور اسلامی اصول سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ وہ مادی علوم و فنون کے ماہر کہلانے کے باوجود مذہب اور دین کی ابتدائی معلومات سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں، اور کھلے اور چھپے کفر کی ان ساری اقسام سے بھی اگر کچھ خوش نصیب مسلمان بچ جائیں تو فحاشی، عریانی، ننگے ناچ، رقص و سرور کی محفلوں اور گھر گھر ریڈیو کے ذریعہ فلمی گانوں اور سینماؤں کی زہریلی فضاؤں سے کون

کی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔ (پ ۲۵)

امام تفسیر ابوالعالیہ نے فرمایا کہ اقامت دین سے مراد اخلاص ہے اور لا تتفرقوا کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں عداوت نہ کرو، بھائی بھائی بن کر رہو۔

اس وصیت کے بعد قرآن میں بنی اسرائیل کے تفرق کا بیان کر کے اہل اسلام کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے طریقہ پر نہ جائیں، اس میں ارشاد ہے:

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔

حضرت ابوالعالیہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ لفظ بغیا بینہم میں اشارہ ہے کہ ایسے اختلاف کا عداوت اور جنگ و جدل تک پہنچنا کبھی دین کے سبب سے نہیں ہوتا بلکہ بغیا علی دنیا و ملکھا و زخرفھا و زینتھا و سلطانتھا۔ (جامع العلم ۸۴/۲) یعنی یہ عداوت جب بھی غور کرو تو اس کا سبب دنیا، حُب مال یا حب جاہ ہوتا ہے جس کو نفس و شیطان خدمت دین کا عنوان دے کر مزین کر دیتا ہے ورنہ اس طرح کے مسائل میں اختلاف رائے کی حد ہی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ مثبت طور پر اپنے عمل کے لیے ایک جانب کو اصلح سمجھ کر اختیار کر لیں، اور اس سے مختلف مسلک رکھنے والوں سے لڑتے نہ پھریں، جس طرح دنیا میں انسان جب بیمار ہوتا ہے اپنے معالجہ کے لیے کسی ایک حکیم یا ڈاکٹر کا انتخاب کر کے صرف اسی کے قول پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرتا ہے، مگر دوسرے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہتا نہیں پھرتا، ایک مقدمہ میں آپ کسی ایک شخص کو وکیل بنا کر اپنا مقدمہ اس کے سپرد کر دیتے ہیں مگر دوسرے وکلاء سے لڑتے نہیں پھرتے، اجتہادی مختلف فیہ مسائل میں بھی ٹھیک یہی آپ کا طرز عمل ہونا چاہئے۔

(وحدت امت، جواہر الفقہ ۴۱۶/۱، مطبوعہ پاکستان)

کان پر جو نہیں رہتی تو اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ فروعی بحثیں ہم اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہے ہیں، اگر ان میں کچھ للہیت اور اخلاص ہوتا تو ہم ان حالات کے تحت اسلام اور دین کے تقاضوں کو پہنچانے اور فروع سے زیادہ اصول اسلام کی حفاظت میں لگے ہوتے، ہم نے تو گویا علمی اور دینی خدمات کو انہیں فروعی مباحث میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور سعی و عمل کی پوری توانائی اسی پر لگا رکھی ہے، اسلام کے اصولی اور بنیادی مسائل اور ایمان کی سرحدوں کو دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی چھوڑ دیا ہے، لڑنا کس محاذ پر چاہئے تھا اور ہم نے طاقت کس محاذ پر لگا دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تو تحزب و تعصب کے غلو کا نتیجہ ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو توڑ کر تفرق و تشتت اور جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر و استہزاء تک پہنچ جانا ہے جو کسی شریعت و ملت میں روا نہیں اور افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خدمت علم دین کے نام پر کیا جاتا ہے اور جب یہ معاملہ ان علماء کے متبعین عوام تک پہنچتا ہے تو وہ اس لڑائی کو ایک جہاد قرار دے کر لڑتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود اپنے ہی دست و بازو سے ہونے لگے اس کو کسی غنیم کی مدافعت اور کفر و الحاد کے ساتھ جنگ کی فرصت کہاں۔

قرآن و حدیث میں اسی تجاز و عن الحدود کا نام تفرق ہے، جو جائز اختلاف رائے سے الگ ایک چیز ہے، قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔ (آل عمران پ ۴)

اور تم اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو، سارے کے سارے اور نہ تم تفرقہ ڈالو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وصیت کا ذکر ہے جو تمام انبیاء سابقین کو

باہمی آویزش کو ہوا دینے کے اسلام کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل پر لگ جائیں، تو پھر ہماری جنگ، جو فساد کی صورت اختیار کر چکی ہے دوبارہ جہاد میں تبدیل ہو جائے گی، اور اس کے نتیجے میں عوام کا رخ بھی باہمی جنگ و جدل سے پھر کر دین کی صحیح خدمت کی طرف ہو جائے گا۔ (اختلاف امت پر ایک نظر ۴۲۵/۵، جواہر الفقہ)

ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا نہایت غلط استعمال

ہماری ساری توانائی اور علم و تحقیق کا زور آپس کے اختلافی مسائل پر صرف ہوتا ہے، وہی ہمارے وعظوں، جلسوں، رسالوں اور اخباروں کا موضوع بحث بنتے ہیں، ہمارے اس عمل سے عوام یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین اسلام صرف ان دو چیزوں کا نام ہے اور جس رخ کو انہوں نے اختیار کر لیا ہے، اس کے خلاف کو گمراہی اور اسلام دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہماری وہ طاقت جو کفر و الحاد اور بے دینی اور معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے مقابلہ پر خرچ ہوتی، آپس کی جنگ و جدل میں خرچ ہونے لگتی ہے، اسلام و ایمان ہمیں جس محاذ پر لڑنے اور قربانی دینے کے لیے پکارتا ہے وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا نظر آتا ہے، ہمارا معاشرہ سماجی برائیوں سے پر ہے، اعمال و اخلاق برباد ہیں، معاملات و معاہدات میں فریب ہے۔ سود مزار بازی، شراب، خنزیر، بے حیائی، بدکاری ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انبیاء کے جائز وارث اور ملک و ملت کے نگہبانوں کو آج بھی اپنے سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں پر جتنا غصہ آتا ہے اس سے آدھا بھی ان خدا کے باغیوں پر کیوں نہیں آتا؟ اور آپس کے نظریاتی اختلاف کے وقت جس جوش ایمانی کا اظہار ہوتا ہے وہ ایمان کے اس اہم محاذ پر کیوں ظاہر نہیں ہوتا؟ ہمارا زور زبان اور زور قلم جس شان سے اپنے اختلافی مسائل میں جہاد کرتا ہے اس کا کوئی حصہ سرحدات

ذرا اس پہلو سے غور کریئے اور سوچیئے!

فرتوں اور جماعتوں کے ذمے دار اس پر غور کریں کہ جن مسائل میں ہم جھگڑ رہے ہیں کیا وہی اسلام کے بنیادی مسائل ہیں، جن کے لیے قرآن نازل ہوا؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے؟ آپ نے اپنی زندگی ان کے لیے وقف کر دی، اور ان کے پیچھے ہر طرح کی قربانیاں دیں یا بنیادی مسائل اور قرآن اور اسلام کا اصلی مطالبہ کچھ اور ہے؟ جس ملک میں ایک طرف عیسائی مشنریاں اپنی پوری قوت اور دنیاوی چمک دمک کے ساتھ اس کو عیسائی ملک بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں، ایک طرف کھلے بندوں خدا اور رسول اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، ایک طرف قرآن اور اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جس کو دنیا سے مٹانے ہی کے لیے قرآن اور اسلام آیا تھا، اس جگہ صرف فروعی مسائل اور ان کی تحقیق و تنقید اور ترویج کی کوششوں میں الجھ کر ان بنیادی مہمات سے غفلت برتنے والوں سے اگر اللہ تعالیٰ و رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ ہمارے دین پر یہ افتادیں پڑ رہی تھیں تم نے اس کے لیے کیا کیا؟ تو ہمارا کیا جواب ہوگا، مجھے یقین ہے کہ کوئی فرقہ، کوئی جماعت جب ذرا اپنے وقتی جھگڑوں سے بلند ہو کر اس کو سوچے گی تو اس کو اپنی موجودہ مصروفیات پر ندامت ہوگی، اور اس کی کوشش کا رخ بدلے گا، اس کے نتیجے میں باہمی آمیزش یقیناً کم ہوگی، میں اس وقت کسی کو یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے خیالات و مزعومات کو بدلے۔

گذارش صرف اتنی ہے کہ اپنی توانائی صرف کرنے کا صحیح محل تلاش کر کے اس پر لگا دیں اور باہمی اختلافات کو صرف حلقہ درس یا فتویٰ یا تحقیقی رسائل تک محدود کر دیں، اور ان میں بھی لب و لہجہ قرآنی اصول دعوت کے مطابق نرم رکھیں، فقرے کسنے اور دوسرے کی توہین کرنے کو زہر سمجھیں، ہمارے پبلک جلسے، اخبارات، اشتہار بجائے

ہوئے لوگوں کو راستے پر لگایا؟ تو آج ہمیں سوچ لینا چاہئے کہ ہمارا کیا جواب ہوگا۔

(وحدت امت، جواہر الفقہ ۱/۲۲۶)

عوام کا ایک مغالطہ اور اس کا حل

بہت سے حضرات مسائل میں علماء کے اختلافات سے پریشان ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم کدھر جائیں، جس کی تہ میں یہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ اب ہم کسی کی نہ سنیں، سب سے آزاد ہو کر جو سمجھ میں آئے کیا کریں، اور بظاہر ان کا یہ معصومانہ سوال حق بہ جانب نظر آتا ہے لیکن ذرا غور فرمائیں تو ان کو اس کا جواب اپنے گرد و پیش کے معاملات میں خود ہی مل جائے گا۔

ایک صاحب بیمار ہوئے ڈاکٹروں یا حکیموں کی رایوں میں تشخیص و تجویز کے بارے میں اختلاف ہو گیا تو وہ کیا کرتے ہیں؟ یہی ناکہ وہ ان ڈاکٹروں، حکیموں کی تعلیمی ڈگریاں معلوم کر کے یا پھر ان کے مطب میں علاج کرانے والے مریضوں سے یا دوسرے اہل تجربہ سے دریافت کر کے اپنے علاج کے لیے کسی ایک ڈاکٹر کو متعین کر لیتے ہیں، اسی کی تشخیص و تجویز پر عمل کرتے ہیں، مگر دوسرے ڈاکٹروں، حکیموں کو برا بھلا کہتے نہیں پھرتے۔ یہاں کسی کا یہ خیال نہیں ہوتا کہ معالجوں میں اختلاف ہے تو سب کو چھوڑ، اپنی آزاد رائے سے جو چاہو کرو، کیا یہی طرز عمل علماء کے اختلاف کے وقت نہیں کر سکتے؟

ایک مثال اور لیجئے!

آپ کو ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنا ہے، قانون جاننے والے وکلاء سے مشورہ کیا، ان میں اختلاف رائے ہوا، کوئی آدمی یہ تجویز نہیں کرتا کہ مقدمہ دائر کرنا ہی چھوڑ بیٹھے یا پھر کسی وکیل کی نہ سنے خود اپنی رائے سے جو سمجھ میں آئے کر لے، بلکہ ہوتا

اور اصول ایمانی پر ہونے والی یلغار کے مقابلہ میں کیوں صرف نہیں ہوتا؟ مسلمانوں کو مرتد بنانے والی کوششوں کے بالمقابل ہم سب بنیانِ مریضوں کیوں نہیں بن جاتے؟

آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ بعثتِ انبیاء اور نزولِ قرآن کا وہ مقصد عظیم جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا اور جس نے غیروں کو اپنا بنالیا، جس نے اولادِ آدم کو بہیمیت سے نکال کر انسانیت سے سرفراز کیا اور جس نے ساری دنیا کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، کیا وہ صرف یہی مسائل تھے جن میں ہم الجھ کر رہ گئے ہیں، اور کیا دوسروں کو ہدایت پر لانے کا طریق اور پیغمبرانہ دعوت کا یہی عنوان تھا جو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے؟

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ۔ (پ ۲۷، سورہ حدید)

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ کے ذکر اور اس کے نازل کئے ہوئے حق کی طرف جھک جائیں۔

آخر وہ کون سا وقت آئے گا جب ہم اپنے نظریاتی اور نظامی مسائل سے ذرا آگے بڑھ کر اصولِ اسلام کی حفاظت اور بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کو اپنا اصلی فرض سمجھیں گے، ملک میں عیسائیت اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی خبر لیں گے، قادیانیت کا انکارِ حدیث اور تحریفِ دین کے لیے قائم شدہ اداروں کا پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کے ذریعے مقابلہ کریں۔

اور اگر ہم نے یہ نہ کیا اور محشر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ سوال فرمایا کہ میری شریعت اور میرے دین پر یہ حملے ہو رہے تھے، اسلام کے نام پر کفر پھیلایا جا رہا تھا، میری امت کو میرے دشمنوں کی امت بنانے کی کوشش مسلسل جاری تھی، قرآن و سنت کی کھلے طور پر تحریف کی جا رہی تھی، خدا اور رسول کی نافرمانی اعلانیہ کی جا رہی تھی، تم مدعیانِ علم کہاں تھے؟ تم نے اس کے مقابلہ پر کتنی محنت اور قربانی پیش کی؟ کتنے بھٹکے

علمائے کرام سے دردمندانہ گزارش

اس لیے ملت کا درد اور اسلام و ایمان کے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے حضرات علماء سے میری دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ مقصد کی اہمیت اور نزاکت کو سامنے رکھ کر سب سے پہلے تو اپنے دلوں میں اس کا عہد کریں کہ اپنی علمی و عملی صلاحیت اور زبان و قلم کے زور کو زیادہ سے زیادہ اس محاذ پر لگائیں گے جس کی حفاظت کے لیے قرآن و حدیث آپ کو بلا رہے ہیں۔

(۱) علمائے کرام! اس بات کا عہد بھی کیجئے اور فیصلہ بھی کہ اس کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل میں زیادہ سے زیادہ وقت نکالیں گے۔

(۲) دوسرے یہ کہ آپس کے نظریاتی اور اجتہادی اختلاف کو صرف اپنے اپنے حلقہ درس اور تصنیف و تالیف اور فتویٰ تک محدود رکھیں گے، عوامی جلسوں، اخباروں، اشتہاروں، باہمی مناظروں، اور جھگڑوں کے ذریعہ ان کو نہ اچھالیں گے، ان حلقوں میں بھی پیغمبرانہ اصول دعوت و اصلاح کے تابع دلخراش عنوان اور طعن و تشنیع، استہزاء و تمسخر اور صحافیانہ فقرہ بازی سے گریز کریں گے۔

(۳) تیسرے یہ کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی بیماریوں کی اصلاح کے لیے دلنشین عنوان اور مشفقانہ لب و لہجہ کے ساتھ کام شروع کر دیں گے۔

(۴) چوتھے یہ کہ الحاد و بے دینی اور تحریف قرآن و سنت کے مقابلہ کے لیے پیغمبرانہ اصول دعوت کے تحت حکیمانہ تدبیروں، مشفقانہ و ناصحانہ بیانوں اور دلنشین دلائل کے ذریعہ مجادلتہ بالقی ہی احسن کے ساتھ اپنے زور زبان اور زور قلم کو وقف کر دیں گے۔ (وحدت امت، جواہر الفقہ ۱/۴۲۷، مطبوعہ پاکستان)

یہی ہے، مختلف طریقوں سے ہر شخص اتنی تحقیق کر لیتا ہے کہ ان میں کون سا وکیل اچھا جاننے والا اور قابل اعتماد ہے، اس کو اپنا وکیل بنا لیتا ہے اور دوسرے وکلا کو باوجود اختلاف کے دشمن نہیں سمجھتا، برا بھلا نہیں کہتا اس سے لڑتا نہیں پھرتا۔ یہی فطری اور سہل اصول اختلاف علماء کے وقت کیوں اختیار نہیں کیا جاتا۔

یہاں ایک بات یہ بھی سن لی جائے کہ بیماری اور مقدمے کے معاملات میں تو اگر آپ نے کسی غلط ڈاکٹر یا غیر معتمد وکیل پر اعتماد کر کے اپنا معاملہ اس کے حوالے کر دیا تو اس کا جو نقصان پہنچنا ہے وہ آپ کو ضرور پہنچے گا، مگر علماء کے اختلاف میں اس نقصان کا بھی خطرہ نہیں۔ حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی عالم سے سوال کیا اور اس نے فتویٰ غلط دے دیا تو اس کا گناہ سوال کرنے والے پر نہیں، بلکہ فتویٰ دینے والے پر ہے، شرط یہ ہے کہ سوال اس شخص سے کیا گیا ہو جس کا عالم ہونا آپ نے ایسی ہی تحقیق و جستجو کے ذریعے معلوم کیا ہو جو اچھے معالج اور اچھے وکیل کی تلاش میں آپ کیا کرتے ہیں، اپنی مقدور بھر صحیح عالم کی تلاش و جستجو کر کے آپ نے ان کے قول پر عمل کر لیا، تو آپ اللہ کے نزدیک بری ہو گئے۔ اگر اس نے غلط بھی بتا دیا ہے تو آپ پر اس کا کوئی نقصان یا الزام نہیں۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہئے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں تو آپ اس کا ایم بی، بی، ایس ہونا بھی معلوم کریں، اور یہ بھی کہ اس کے مطب میں کس طرح کے مریض زیادہ شفا یاب ہوتے ہیں، مگر عالم کی تلاش میں صرف عمامے، کرتے اور ڈاڑھی کو یا زیادہ سے زیادہ جلسے میں کچھ بول لینے کو معیار بنالیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنی ذمہ داری سے بری نہیں، اس نے جواب میں کوئی غلطی کی تو آپ بھی اس کے مجرم قرار پائیں گے۔

(وحدت امت، جواہر الفقہ ۱/۴۲۷)

باب ۷ تقلید کا بیان

حکم و اطاعت خداوندی کی چار قسمیں

حکم و اطاعت صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ہے ”ان الحکم الا للہ“ مگر اس کے حکم اور اس کی اطاعت کی عملی صورت چار حصوں میں منقسم ہے پہلی قسم ایک وہ جس چیز کا حکم صراحۃً خود حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمایا اور اس میں کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں جیسے شرک و کفر کا انتہائی جرم ہونا۔ ایک اللہ وحدہ کی عبادت کرنا اور آخرت اور قیامت پر یقین رکھنا اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری برحق رسول ماننا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو فرض سمجھنا یہ وہ چیزیں ہیں جو براہ راست احکام ربانی ہیں، ان کی تعمیل بلا واسطہ حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

دوسری قسم

دوسرا حصہ احکام کا وہ ہے جس میں تفصیلات و تشریحات کی ضرورت ہے ان میں قرآن کریم اکثر ایک مجمل یا مبہم حکم دیتا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کی جاتی ہے، پھر وہ تفصیل و تشریح جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کے ذریعہ فرماتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی وحی ہوتی ہے اگر اس تفصیل و تشریح میں اجتہادی طور پر کوئی کمی یا کوتاہی رہ جاتی ہے تو بذریعہ وحی اس کی اصلاح فرمادی جاتی ہے اور بالآخر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل جو آخر میں ہوتا ہے وہ حکم الہی کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس قسم کے احکام کی اطاعت بھی اگرچہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے لیکن ظاہری اعتبار سے چونکہ یہ احکام صریح طور پر قرآن نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امت کو پہنچے ہیں، اس لیے ان کی اطاعت ظاہری اعتبار سے اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کہلاتی ہے جو حقیقت میں اطاعت الہی کے ساتھ متحد ہونے کے باوجود ظاہری اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اس لیے پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ اطاعت رسول کا حکم مستقلاً مذکور ہے۔

تیسری قسم

تیسرا درجہ احکام کا وہ ہے جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہے نہ حدیث میں یا ذخیرہ احادیث میں اس کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں ایسے احکام میں علماء مجتہدین قرآن و سنت کے منصوصات اور زیر غور مسئلہ کے نظائر میں غور و فکر کر کے ان کا حکم تلاش کرتے ہیں۔ ان احکام کی اطاعت بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے قرآن و سنت سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اطاعت خداوندی ہی کی ایک فرد ہے، مگر ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ فقہی فتاویٰ کہلاتے ہیں اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔

اس تیسری قسم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں کتاب و سنت کی رو سے کوئی پابندی عائد نہیں بلکہ ان میں عمل کرنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں کریں جن کو اصطلاح میں مباحات کہا جاتا ہے ایسے احکام میں عملی انتظام حکام و امراء کے سپرد ہے کہ وہ حالات اور مصالح کے پیش نظر کوئی قانون بنا کر سب کو اس پر چلائیں مثلاً شہر کراچی میں ڈاکخانے پچاس ہوں یا سو، پولیس اسٹیشن کتنے ہوں، ریلوے کا نظام کس طرح ہو، آباد کاری کا انتظام کن قواعد پر کیا جائے یہ سب مباحات ہیں، ان کی کوئی

کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے، جیسے وہ اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ سکتے ہیں ”ہم رجال ونحن رجال“ یعنی وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوسناک جو نہ عربی زبان سے واقف ہے نہ قرآن کے حقائق و معارف نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تفسیر سے۔ محض قرآن کا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو قرآن کا عالم کہنے لگا۔ قرآن کریم کی جو تفسیر و تشریح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بلا واسطہ شاگرد یعنی صحابہ کرام سے منقول ہے، اس سب سے قطع نظر جو بات ذہن میں آگئی اس کو قرآن کے سر تھوپ دیا۔ حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلم کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کے نسخے لکھے لکھائے لوگوں کو پہنچا دیتے، رسول کو معلم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات صرف کتاب اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں کسی بھی علم و فن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر کبھی کوئی شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹری یا طب یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا، انجینئری کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینئر نہیں بنا، کپڑا سینے یا کھانا پکانے کی کتابیں دیکھ کر کوئی درزی یا باورچی نہیں بنا، بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم و تعلم اور معلم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے۔

مگر افسوس کہ قرآن و سنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے کسی معلم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ چنانچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت اس طرف غلو میں بہہ گئی کہ صرف قرآن کے مطالعہ کو کافی سمجھ بیٹھے۔ علمائے سلف کی تفسیروں و تعبیروں کو اور ان کی اقتداء و اتباع کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف ایک بھاری جماعت مسلمانوں کی اس غلو میں مبتلا ہو گئی کہ اندھا دھند جس کو چاہا اپنا مقتداء و پیشوا بنالیا، پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی، نہ یہ معلوم کہ جس کو ہم مقتداء اور پیشوا بنا رہے ہیں یہ علم و عمل اور اصلاح و تقویٰ کے معیار پر صحیح بھی

جانب نہ واجب ہے نہ حرام بلکہ اختیاری ہے، لیکن یہ اختیار عوام کو دے دیا جائے تو کوئی نظام نہیں چل سکتا اسی لیے نظام کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ آیت مذکورہ میں اولوالامر کی اطاعت سے علماء اور حکام دونوں کی اطاعت مراد ہے۔ اس لیے اس آیت کی رو سے فقہی تحقیقات میں فقہاء کی اطاعت اور انتظامی امور میں حکام و امراء کی اطاعت واجب ہو گئی۔ (معارف القرآن ۲/۴۵۲)

مسئلہ تقلید میں افراط و تفریط، اندھی تقلید کی ممانعت

لَا تَعْلُوا فِي دِئِئِكُمْ۔ (سورہ مائدہ پ ۶)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے لکھا ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لیے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریفِ دین کا راستہ ہے، کچھلی امتوں میں یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کر لیے، اور ہر آنے والی نسل ان میں اضافے کرتی رہی، یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا اور لوگوں کے اضافے کیا ہیں، شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ کے اندر یہ بیان فرمایا ہے کہ تحریفِ دین کے دنیا میں کیا کیا اسباب پیش آئے ہیں اور شریعت اسلام نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا ہے کہ کسی سوراخ سے یہ وبا امت میں نہ پھیلے، ان اسباب میں سے دین کے بارے میں تعمق و تشدد یعنی غلو فی الدین کو بڑا سبب قرار دیا ہے مگر افسوس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر اہتمام اور شریعت کی اتنی پابندیوں کے باوجود امت مسلمہ اسی غلو کی بری طرح شکار ہے۔ دین کے سارے ہی شعبوں میں اس کے آثار نمایاں ہیں، ان میں سے بالخصوص جو چیز ملت کے لیے مہلک اور انتہائی مضر ثابت ہو رہی ہے وہ دینی مقتداء و پیشواؤں کا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت تو اس پر گئی ہے کہ مقتداء و پیشوا علماء و عرفاء کوئی چیز نہیں،

اُترتا ہے یا نہیں اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے وہ قرآن و سنت کے مخالف تو نہیں۔ (معارف القرآن ۲/۶۲۳)

معتدل راستہ

شریعت اسلام نے غلو سے بچا کر ان دونوں کے درمیان طریقہ کار یہ بتلایا کہ کتاب اللہ کو رجال اللہ سے سیکھو اور رجال اللہ کو کتاب اللہ سے پہچانو۔ یعنی قرآن و سنت کی مشہور تعلیمات کے ذریعہ پہلے ان لوگوں کو پہچانو جو کتاب و سنت کے علوم میں مشغول ہیں، اور ان کی زندگی کتاب و سنت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ پھر کتاب و سنت کے ہر الجھے ہوئے مسئلہ میں ان کی تفسیر و تشریح کو اپنی رائے سے مقدم سمجھو اور ان کا اتباع کرو۔ (معارف القرآن ۲/۶۲۳، نساء)

کسی کی تقلید کرنے کا شرعی معیار اور ائمہ مجتہدین کی تقلید کی حقیقت

”أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ“۔ (سورہ مائدہ)

قرآن کریم کے اس جملہ نے اقتداء کا نہایت معقول اور واضح معیار دو چیزوں کو بنایا ہے۔ علم اور اہتداء۔

علم سے مراد منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کے طریقوں کا جاننا ہے اور اہتداء سے مراد اس مقصد کی راہ پر چلنا یعنی صحیح علم پر عمل مستقیم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس شخص کو مقتداء بنانا ہو تو پہلے یہ دیکھو کہ جس مقصد کے لیے اس کو مقتداء بنایا ہے وہ اس مقصد اور اس طریق سے پوری طرح واقف بھی ہے یا نہیں پھر یہ دیکھو کہ وہ اس کی راہ پر چل بھی رہا ہے؟ اور اس کا عمل اپنے علم کے مطابق ہے یا نہیں۔ غرض کسی کو مقتداء بنانے کے لیے علم صحیح اور عمل مستقیم کے معیار سے جانچنا ضروری

ہے۔ قرآن کریم کے اس جملہ نے سب کو ایک واضح حکمت کا سبق دیا کہ ان میں سے کوئی چیز متقدم اور پیشوا بنانے کے لیے ہرگز کافی نہیں، بلکہ ہر انسان پر سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے سفر کا رخ متعین کرے پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ دیکھے کہ کون ایسا انسان ہے جو اس مقصد کا راستہ جاننے والا بھی ہو، اور اس راستہ پر چل بھی رہا ہو، جب کوئی ایسا انسان مل جائے تو بے شک اس کے پیچھے لگ لینا اس کو منزل مقصود پر پہنچا سکتا ہے۔ یہی حقیقت ہے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی کہ وہ دین کو جاننے والے بھی ہیں، اور اس پر عمل پیرا بھی، اس لیے نہ جاننے والے ان کا اتباع کر کے دین کے مقصد یعنی اتباع خدا اور رسول کو حاصل کر سکتے ہیں۔

(معارف القرآن ۳/۲۴۹، مائدہ)

تقلید کی حقیقت اور مطلق تقلید کا وجوب

آیت مذکورہ کا یہ جملہ: ”فَاسْتَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“۔

(سورہ نحل پ ۱۴)

اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارے میں آیا ہے مگر الفاظ عام ہیں جو تمام معاملات کو شامل ہیں، اس لیے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے، اور نقلی بھی، کہ جو لوگ یہ احکام نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں، اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں اسی کا نام تقلید ہے۔ یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے، اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی، امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں، وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول

جن کو عربی زبان، عربی لغت اور محاورات اور طرق استعمال کا نیز قرآن و سنت سے متعلقہ تمام علوم کا معیاری علم اور ورع و تقویٰ کا اونچا مقام حاصل ہو، جیسے امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ یا اوزاعیؒ، فقیہ ابواللیثؒ وغیرہ جن میں حق تعالیٰ نے قرب زمانہ نبوت و صحبت صحابہ و تابعین کی برکت سے شریعت کے اصول و مقاصد سمجھنے کا خاص ذوق اور منصوص احکام سے غیر منصوص کو قیاس کر کے حکم نکالنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا۔ ایسے مجتہد فیہ مسائل میں عام علماء کو بھی ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید لازم ہے۔ ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی نئی رائے اختیار کرنا خطا ہے، یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء، محدثین و فقہاء، امام غزالیؒ، رازیؒ، ترمذیؒ، طحاویؒ، مزنیؒ، ابن ہمامؒ، ابن قدامہؒ اور اسی معیار کے لاکھوں علماء سلف و خلف علوم عربیت و علوم شریعت کی اعلیٰ مہارت حاصل ہونے کے باوجود ایسے اجتہادی مسائل میں ہمیشہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کے پابند رہے ہیں، سب نے مجتہدین کے خلاف اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دینا جائز نہیں سمجھا۔

البتہ ان حضرات کو علم و تقویٰ کا وہ معیاری درجہ حاصل تھا کہ مجتہدین کے اقوال و آراء کو قرآن و سنت کے دلائل سے جانچتے اور پرکھتے تھے، پھر ائمہ مجتہدین میں جس امام کے قول کو کتاب و سنت کے ساتھ اقرب پاتے اس کو اختیار کر لیتے تھے۔ مگر ائمہ مجتہدین کے مسلک سے خروج اور ان سب کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا ہرگز جائز نہ جانتے تھے، تقلید کی اصل حقیقت اتنی ہی ہے۔

(معارف القرآن ۳۳۴/۵)

تقلید شخصی کا آغاز اور اس کا محرک

اس کے بعد روز بروز علم کا معیار گھٹتا گیا اور تقویٰ و خدا ترسی کے بجائے اغراض نفسانی غالب آنے لگیں، ایسی حالت میں اگر یہ آزادی دی جائے کہ جس مسئلہ میں

کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت ہے نہیں اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔

(معارف القرآن ۳۳۴/۵)

علماء راسخین و مجتہدین کے لیے تقلید کا حکم

البتہ وہ علماء جو خود قرآن و حدیث کو اور مواقع اجماع کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کو ایسے احکام میں جو قرآن و حدیث میں صریح اور واضح طور پر مذکور ہیں، اور علماء، صحابہ اور تابعین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف بھی نہیں۔ ان احکام میں وہ علماء براہ راست قرآن و حدیث اور اجماع پر عمل کریں، ان میں علماء کو کسی مجتہد کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ (معارف القرآن ۳۳۴/۵)

مجتہد فیہ مسائل کی تعریف اور ان میں تقلید کا حکم

لیکن وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں یا جن میں آیات قرآن اور روایات حدیث میں بظاہر کوئی تعارض نظر آتا ہے یا جن میں صحابہ اور تابعین کے درمیان قرآن و سنت کے معنی متعین کرنے میں اختلاف پیش آیا ہے۔ یہ مسائل و احکام محل اجتہاد ہوتے ہیں۔ ان کو اصطلاح میں (مجتہد فیہ) مسائل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ جس عالم کو درجہ اجتہاد حاصل نہیں اس کو بھی ان مسائل میں کسی امام مجتہد کی تقلید ضروری ہے۔ محض اپنی ذاتی رائے کے بھروسے پر ایک آیت اور روایت کو ترجیح دے کر اختیار کرنا اور دوسری آیت یا روایت کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا اس کے لیے جائز نہیں۔ اسی طرح جو احکام قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں ان کو قرآن و سنت کے بیان کردہ اصول سے نکالنا اور ان کا حکم شرعی متعین کرنا یہ بھی نہیں مجتہدین امت کا کام ہے

دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے اختیار کر لے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کر لے گا کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباع خداوندی کے بجائے اتباع نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔

(البلاغ ص: ۴۱۹، مضمون مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی)

تقلید شخصی کے وجوب کی دلیل اور نظیر

اس کی مثال بعینہ وہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے باجماع صحابہ قرآن کے سبعتہ احرف (یعنی سات لغات) میں سے صرف ایک لغت کو مخصوص کر دینے میں کیا کہ اگرچہ ساتوں لغات قرآن ہی کے لغات تھے جبریل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن کریم عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہ یہ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت میں قرآن کریم لکھا اور پڑھا جائے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسی ایک لغت کے مطابق تمام مصاحف لکھوا کر اطراف عالم میں بھجوائے اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لغات حق نہیں تھے بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن از تحریف کی بنا پر صرف ایک ہی لغت اختیار کر لیا گیا، اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں، ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لیے معین کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معین کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابل تقلید نہیں بلکہ اپنی صواب دید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کر لیا، اور دوسرے ائمہ کو بھی اسی طرح واجب الاحترام سمجھا۔ (معارف القرآن ۳۳۵/۵)

چاہیں کسی ایک امام کا قول اختیار کر لیں، اور جس میں چاہیں کسی دوسرے کا قول لیں، تو اس کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ لوگ اتباع شریعت کا نام لے کر اتباع ہوئی میں مبتلا ہو جائیں کہ جس امام کے قول میں اپنی غرض نفسانی پوری ہوتی نظر آئے اس کو اختیار کر لیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی دین و شریعت کا اتباع نہیں ہوگا، بلکہ اپنی اغراض و ہویٰ کا اتباع ہوگا، جو باجماع امت حرام ہے علامہ شاطبیؒ نے موافقات میں اس پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ابن تیمیہؒ نے بھی عام تقلید کی مخالفت کے باوجود اس طرح کے اتباع کو اپنے فتاویٰ میں باجماع امت حرام کہا ہے، اس لیے متاخرین فقہاء نے یہ ضروری سمجھا کہ عمل کرنے والوں کو کسی ایک ہی امام مجتہد کی تقلید کا پابند کرنا چاہئے یہیں سے تقلید شخصی کا آغاز ہوا جو درحقیقت ایک انتظامی حکم ہے جس سے دین کا انتظام قائم رہے اور لوگ دین کی آڑ میں اتباع ہویٰ کے شکار نہ ہو جائیں۔

(معارف القرآن ۳۳۵/۵ ج ۱)

تقلید شخصی ایک انتظامی ضرورت ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

حضرت والد صاحبؒ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلید شخصی کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ اس دور ہوئی وہوس میں اس کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے، اور جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکمہ کا سوال آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے، کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو تو کم از کم ان کے مساوی تو ہو اور آج اس مساوات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا البتہ ساتھ ہی حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ایک انتظامی فتویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے وزنی دلائل موجود ہیں، لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی

عقلی دلیل

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جسے بیمار آدمی کو شہر کے حکیم اور ڈاکٹروں میں سے کسی ایک ہی کو اپنے علاج کے لیے متعین کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے کیونکہ بیمار اپنی رائے سے کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر دوا استعمال کرے کبھی کسی دوسرے سے پوچھ کر یہ اس کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے وہ جب کسی ڈاکٹر کا انتخاب اپنے علاج کے لیے کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے ڈاکٹر ماہر نہیں یا ان میں علاج کی صلاحیت نہیں، خفی، شافی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ اور باہمی جدال و شقاق کی گرم بازاری نہ کوئی دین کا کام ہے نہ کبھی اہل بصیرت علماء نے اسے اچھا سمجھا ہے، بعض علماء کے کلام میں علمی بحث و تحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا، اور بعد میں طعن و طنز تک نوبت آ گئی، پھر جاہلانہ جنگ و جدال نے وہ نوبت پہنچادی جو آج عموماً دینداری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا۔ **فَالِی اللّٰہِ الْمَشْتٰکِی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔**
(معارف القرآن ۵/۳۳۵، سورۃ نحل)

مطلق تقلید اور تقلید شخصی کے متعلق اہم سوالوں کے جوابات

سوال: مسائل ذیل کے بارے میں کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے؟

کسی امام مجتہد کی تقلید عام مسلمانوں کے لیے فرض ہے یا واجب یا مباح؟

الجواب: مطلق تقلید فرض ہے جس قرآن:

فَاسْئَلُوا اَهْلَ الدِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ اللّٰہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور رسول اللہ کی اطاعت کرو اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔

اولی الامر کی تفسیر حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت ابن عباس اور عطاء و مجاہد اور ضحاک و ابو العالیہ اور حسن بصری وغیرہم صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے خلفاء، علماء و فقہاء سے کی ہے، اور خود مولانا صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس اہل حدیث اس معنی کو اپنی تفسیر میں قبول کرتے ہیں اور حدیث میں ہے:

انما شفاء العی السؤل نہ جاننے والے کی شفاء اس میں ہے کہ جاننے والوں سے دریافت کرے۔

لیکن اب کلام اس میں ہے کہ آیا ہر وہ شخص جس کو لغتہ عرف میں عالم کہا جاتا ہے اس کام کو انجام دے سکتا ہے یا کوئی خاص عالم و فقیہ مراد ہے۔

اجتہاد کی تعریف اور مجتہد کے شرائط

علمائے سلف نے ایسے عالم کے لیے جس کی تقلید کرنی چاہئے ایک معیار مقرر کیا ہے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ محدث دہلوی اپنی کتاب عقد الجید میں فرماتے ہیں:

الاجتہاد علی مایفہم من کلام العلماء استفراغ الجہد فی إدراک الأحکام الشرعیۃ کلیتھا فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی

والإجماع والقياس (إلى أن قال) وشرطه أنه لا بدّ له أن يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالأحكام ومواقع الإجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة ولا حاجة إلى الكلام والفقه۔

(ثم قال) ولا بأس أن يورد كلام البغوي في هذا الموضع قال البغوي والمجتهد من جمع خمسة أنواع من العلم علم كتاب الله عز وجل وعلم سنة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وعلم أقاويل علماء السلف من جماعهم واختلافهم وعلم اللغة وعلم القياس وهو طريق استنباط الحكم عن الكتاب والسنة إذا لم يجده

کلیات کا مآل چار قسم پر ہے یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس پر۔ اور اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد والے کو ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اس قدر جانتا ہو کہ جو احکام سے متعلق ہے، اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور ناسخ اور منسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو اور اجتہاد میں علم کلام اور اصطلاحی علم فقہ کی کچھ حاجت نہیں، جو ہم نے اجتہاد کی شرط ذکر کی ہے اصول کی کتابوں میں مشروح موجود ہے، اور کچھ مضائقہ نہیں کہ بغوی کا قول اس مقام میں یعنی بیان شرط اجتہاد میں ذکر کیا جائے، بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے کہ پانچ طرح کے علم کا حاوی ہو۔ اول علم کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کا، دوم علم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سوم علم علماء سلف کے اقوال کا کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور اختلاف کس قول میں۔ چہارم علم لغت عربی کا۔ پنجم علم قیاس کا اور قیاس طریقہ حکم کے

إجماع فيجب أن يعلم من علم الكتاب الناسخ والمنسوخ والمجمل والمفسر والخاص والعام والمحكم والمتشابه والكرهية والتحريم والإباحة والندب والوجوب ويعرف من السنة هذه الأشياء، ويعرف منها الصحيح والضعيف والمسند والمرسل ويعرف ترتيب السنة على الكتاب وترتيب الكتاب على السنة حتى لو وجد حديثاً لا يوافق ظاهره الكتاب يهتدى إلى وجه محمله فإن السنة بيان الكتاب ولا تخالفه وإنما يجب معرفة ما ورد منها في أحكام الشرع دون ما عداها من القصص والأخبار والمواعظ وكذلك يجب أن يعرف من علم اللغة ما أتى في كتاب أو سنة في أمور الأحكام

صورت میں کہ حکم مذکور صریح قرآن یا حدیث یا اجماع کے نصوص میں مجتہد نہ پاوے (اب ان پانچوں علموں کی مقدار اصطلاحی علم فقہ کی کچھ حاجت نہیں اور یہ مفصل معلوم کرنی چاہئے کہ مجتہد کو ہر ایک علم کتنا سیکھنا چاہئے) تو قرآن کے علم میں سے اس پر ان باتوں کا جاننا واجب ہے ناسخ و منسوخ مجمل اور مفسر خاص اور عام محکم و متشابه کراہت اور تحریم اباحت اور استحباب اور وجوب کا جاننا اور حدیث میں سے ان اشیاء مذکورہ کا جاننا اور نیز صحیح حدیث اور ضعیف اور مسند اور مرسل کا جاننا اور حدیث کا مرتب کرنا قرآن پر اور قرآن کا حدیث پر جاننا حتی کہ اگر کوئی ایسی حدیث پاوے جس کا ظاہر موافق قرآن کے نہ ہو تو اس کی مطابقت کی صورت کا سراغ لگا سکے، کیونکہ حدیث بیان قرآن مجید کا ہے مخالف قرآن نہیں کہ مطابقت نہ ہو سکے، اور احادیث میں سے صرف ان حدیثوں کا جاننا واجب ہے جو شرعی احکام کے بارے میں وارد ہوئی ہیں،

الإحاطة بجميع لغات العرب
وينبغي أن يتخرج فيها بحيث
يقف على مرام كلام العرب
فيما يدل على المراد من
اختلاف المحال والأحوال لأن
الخطاب ورد بلسان العرب
فمن لم يعرف لا يقف على مراد
الشارع ويعرف أقاويل
الصحابة والتابعين في الأحكام
ومعظم فتاوى فقهاء الأمة حتى
لا يقع حكمه مخالفاً لأقوالهم
فيكون فيه خرق الإجماع وإذا
عرف من كل من هذه الأنواع
معظمه فهو حينئذ مجتهد ولا
يشترط معرفة جميعها بحيث لا
يشذ عنه شيء منها وإذا لم
يعرف نوعاً من هذه الأنواع
فسيبيل التقليد وإن كان
مستبحراً في مذهب واحد من
آحاد أئمة السلف فلا يجوز له
تقلد القضاء ولا التردد للفتيا

نہ اس کے سوا اور حدیثوں کا جاننا جن
میں حکایات اور اخبار اور نصائح مذکور
ہیں، اسی طرح زبان عربی کے ان
الفاظ کا جاننا واجب ہے جو قرآن خواہ
حدیث کے احکامی امور میں واقع
ہوئے ہیں، نہ یہ کہ سب لغت عربی کو
جانے اور بہتر یہ ہے کہ لغت دانی میں
اتنی محنت کرے کہ عرب کے کلام کے
مقصود سے واقف ہو جائے اس طرح
کہ اختلاف مواقع اور حالات کی وجہ
سے کلام مذکور سے یہ مراد ہوتی ہے اس
لیے کہ خطاب شریعت عربی زبان میں
وارد ہوا ہے تو جو شخص عربی نہ جانے گا وہ
شارع علیہ السلام کا مقصود نہ پہچانے گا
اور اقوال صحابہ اور تابعین میں سے اس
قدر جانے جو در باب احکام منقول ہیں
اور بڑا حصہ ان فتوؤں کا جانے جو
امت کے فقہاء نے دیئے ہیں، تاکہ
اس کا حکم مخالف سلف کے اقوال کے نہ
پڑے ورنہ اس صورت میں اجماع کی
مخالفت ہوگی، اور جب ان پانچوں
اقسام کے علموں میں سے بڑا حصہ جانتا

وإذا جمع هذه العلوم و كان
مجانياً للأهواء والبدع متدرعاً
بالورع محترزاً عن الكبائر غير
مصر على الصغائر جاز له أن
يتقلد القضاء ويتصرف في
الشرع بالاجتهاد والفتوى
ويجب على من لم يجمع هذه
الشرائط أن يقلده فيما يعنُّ له
من الحوادث.

انتہی کلام البغوی

ہوگا تو وہ شخص اس وقت مجتہد ہوگا اور یہ
شرط نہیں کہ سب علموں کو بالکل جانتا ہو
حتیٰ کہ کوئی چیز ان علوم کی اس سے باقی
نہ رہے، اور اگر ان علوم پہنچانے میں
سے ایک قسم سے بھی ناواقف ہو تو اس
کی سبیل دوسرے کی تقلید کرنا ہے، اگر
چہ وہ شخص ایک مذہب میں کسی کے ائمہ
سلف میں سے ماہر کامل ہو تو ایسے شخص
کو عہدہ قضاء اختیار کرنا اور فتویٰ دینے

کا امیدوار ہونا درست نہیں۔ اور جس صورت میں کہ ان پانچوں علوم کا جامع اور
خواہشات نفسانی اور بدعتوں سے علیحدہ ہو اور ورع اور تقویٰ کو شعار بنایا ہو اور کبیرہ
گناہوں سے محترز ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ رکھتا ہو تو اس کو قاضی ہونا اور اپنے اجتہاد سے
شرع میں تصرف کرنا جائز ہے، اور اس شخص پر جو ان شرطوں کا جامع نہیں، تقلید کرنی شخص
جامع کی واجب ہے ان حادثوں میں کہ اس کو پیش آویں۔ تمام ہوا کلام بغوی کا۔

الغرض نصوص متواترہ سے یہ امر تو بالکل محقق ہو گیا کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہو اس میں
علماء کی تقلید کرنی چاہئے، اس لیے مطلق تقلید کو تمام محققین اہل حدیث بھی واجب تسلیم
کرتے ہیں۔ اکثر اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے قائل بھی ہیں۔

(جواہر الفقہ ۱/۱۲۳)

تقلید شخصی کی بحث

اب خلاف تقلید شخصی میں رہا (یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ اور ہر حکم میں

تقلید غیر شخصی میں اتنے بڑے بڑے مفاسد پیدا ہو گئے اور آئندہ ان سے بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے اس لیے اس وقت مصلحت شرعی کا تقاضا یہ ہے کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو روکا جائے اور سب کو تقلید شخصی پر جمع کر دیا جائے۔

اس پر اجماع منعقد ہو گیا، چنانچہ محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ جن کی جلالتِ قدر اور علم حدیث کا اعتراف محققین اہل حدیث مثل نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کو بھی ہے اپنے رسالہ الانصاف ص: ۵۹ میں فرماتے ہیں:

وبعد المائین ظہر فیہم المذہب بالمجتہدین بأعیانہم
وکان ہذا هو الواجب فی ذلک الزمان۔
دوسری صدی کے بعد لوگوں میں خاص
المذہب کے مذہب کی پابندی یعنی
تقلید شخصی شروع ہوئی اور اس زمانہ میں
یہی واجب تھی۔

چونکہ مطلق تقلید کے دو فرد میں سے تقلید غیر شخصی مضر ثابت ہوئی اس لیے اب فرض تقلید کا ادا کرنا صرف تقلید شخصی میں منحصر ہو گیا اور بوجہ ذریعہ اداء فرض (بہ ثبوت ظنی) ہونے کے واجب ہو گئی۔ (جواہر الفقہ ۲۲۶۲)

تقلید شخصی کے وجوب کی ایک واضح مثال

خلافت راشدہ کے عہد میں

اہل علم پر مخفی نہیں کہ عرب کے قبائل کی زبانیں عربی ہونے میں مشترک ہونے کے باوجود مختلف تھیں، جیسے ہندوستان میں پورب پچھم اور دلی لکھنؤ کی زبانیں مختلف سمجھی جاتی ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ قرآن مجید کو ان ساتوں لغت پر نازل کیا جاوے تاکہ کسی قبیلہ کو شکایت یا پڑھنے میں کلفت نہ ہو۔ آنحضرت صلی

کرنا) یہ علماء اہل سنۃ والجماعۃ کے نزدیک واجب ہے کیونکہ مطلق تقلید جس کی فرضیت عند الفرقین مسلم ہے اس کے دو فرد ہیں، شخصی اور غیر شخصی اس لیے جائز ہوا کہ اس مطلق فرض کو اس کے جس فرد میں چاہیں ادا کر دیں، تقلید غیر شخصی کر کے بھی اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکیں جیسے تقلید شخصی کر کے بری ہوتے ہیں۔

کیونکہ مامور بہ جب مطلق ہوتا ہے تو اعلیٰ التعین اس کے فرد کو ادا کر دینے سے امور بری الذمہ ہو جاتا ہے دیکھو اگر کوئی شخص اپنے خادم کو حکم کرے کہ کسی آدمی کو بلا لے تو وہ مختار ہے چاہے زید کو بلا لے یا عمر کو یا بکر وغیرہ کو اور وہ جس کو بلا لے گا اپنے فرض منصبی سے بری الذمہ ہو جائے گا۔

اسی لیے چونکہ مامور بنص قرآن مطلق تقلید ہے اور اس کے دو فرد ہیں، صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں دونوں فرد پر عمل ہوتا رہا کوئی تقلید شخصی کرتا تھا اور کوئی غیر شخصی تقلید شخصی کرنے والے غیر شخصی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرتے، اور علیٰ ہذا تقلید غیر شخصی کرنے والے شخصی کرنے والوں کو باطل پر نہ سمجھتے تھے، جس کو انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب روایات سے مشاہد کر کے دکھلایا جائے گا۔

الغرض دونوں قسم کی تقلید زمانہ صحابہ و تابعین میں ہوتی رہی لیکن جب دوسری صدی کے اخیر میں دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین کے بکثرت پیدا ہو گئے، بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کے حرمت و جواز میں یا کراہت و استحباب وغیرہ میں خلاف نہ ہو۔ ادھر ابنائے زمانہ میں ہوا و ہوس کا غلبہ دیکھا گیا، وہ رخصتوں کو تلاش کرنے لگے جس امام مجتہد کا جو مسئلہ اپنی خواہش کے موافق ملا اس کو اختیار کر لیا اور باقی کو پس پشت ڈال دیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہو گیا کہ یہ دین متین ایک خواہشات کا مجموعہ بن جائے اور بجائے اس کے کہ مسلمان اپنے دین کا اتباع کریں۔ اب یہ دین کو اپنی خواہش کے تابع بنا لیں گے اس لیے اس زمانہ کے زیرک اور دور اندیش علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اب

حيث قال فيمن نكح عند شهود فسقة ثم طلقها ثلاثاً فأراد التخلص من الحرمة المغلظة بان النكاح كان فاسداً في الاصل على مذهب الشافعي فلم يقع الطلاق ما نصه وهذا القول يخالف إجماع المسلمين فانهم متفقون على أن من اعتقد حل الشيء كان عليه أن يتعقد ذلك سواء وافق غرضه أو خالف ومن اعتقد تحريمه كان عليه أن يعتقد ذلك في الحالين وهؤلاء المطلقون لا يقولون بفساد النكاح بفسق الولي الا عند الطلاق الثلاث لا عند الاستمتاع والتوارث يكونون في وقت يقلّدون من يفسده وفي وقت يقلّدون من يصححه بحسب الغرض والهوى ومثل هذا لا يجوز باتفاق الأمة (ثم قال بعد ثلاثة أسطر) ونظير هذا أن يعتقد الرجل ثبوت شفعة الجوار اذا كان طالبا لها وعدم ثبوتها اذا كان مشتبهاً فان هذا لا يجوز بالإجماع وكذا من بنى على صحة ولاية الفاسق في حال نكاحه وبنى على فساد ولايته حال طلاقه لم يجز ذلك باجماع المسلمين ولو قال المستفتي المعين أنا لم أكن أعرف ذلك وأنا اليوم التزم ذلك لم يكن من ذلك له لأن ذلك يفتح باب التلاعب بالدين ويفتح الذريعة إلى أن يكون التحليل والتحريم بحسب الأهواء.

(فتاوى ابن تيمية جلد ثانی ص: ۲۴۰ و ۲۴۱)

مقلدین پر اعتراض کرنے والے حضرات سوچیں کہ ان حضرات صحابہ کو وہ کیا کہیں گے جنہوں نے عوام کی غلطی میں پڑ جانے کے خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کئے ہوئے سات لغات میں سے صرف ایک کو متعین واجب کر کے باقی کو ناجائز قرار دے دیا، اور اگر وہ ان حضرات کی طرف سے کوئی توجیہ کرتے ہیں تو کیا

اللہ علیہ وسلم کی اس دعاء و تمنا سے قرآن کریم سات لغات پر نازل ہوا جس کو حدیث کے الفاظ میں سبعة احرف سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (موطا امام مالک) اور عہد نبوت میں ان ساتوں لغت کے موافق قرآن مجید پڑھا جاتا رہا۔

مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مبارک میں جب عجم کی فتوحات ہوئیں اور قرآن کریم عجم میں شائع ہوا، اس وقت لغات سبعة کے تفرق کی وجہ سے اہل عجم حیران ہوئے، اور اندیشہ ہوا کہ یہ لغات سبعة جو آسانی کے لیے طلب کئے گئے تھے اب کہیں مشکلات بلکہ تحریفات کا ذریعہ نہ بن جائیں، اس لیے جامع القرآن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا کہ اب قرآن مجید کو صرف ایک ہی لغت میں پڑھا جائے، بقیہ لغات میں پڑھنے اور لکھنے کی ممانعت فرمادی اور صحابہ کرام کے پورے مجمع نے اس کو یکجہ صواب دیکھا، اور نہایت ضروری خیال کیا کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی۔ غرض باجماع صحابہ سبعة احرف میں سے حرف واحد پر اقتصار کرنا ضروری اور واجب سمجھا گیا۔

بعینہ یہی مثال تقلید شخصی اور غیر شخصی کی ہے کہ قرون خیر میں چونکہ اتباع ہوئی کا غلبہ نہ تھا وہاں تقلید کی دونوں قسموں میں اختیار تھا جس پر چاہے عمل کرے مگر قرون مابعد یعنی تیسری صدی کے اوائل میں جب غلبہ ہوا وہوس مشاہد ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق ہوئے نفسانی لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تو علمائے وقت نے باجماع یہ ضروری سمجھا کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو منع کیا جائے، اور صرف تقلید شخصی ہی واجب سمجھی جائے، ورنہ تقلید غیر شخص کی آڑ میں لوگ محض اپنے نفس کے مقلد بن جائیں گے جو کہ باجماع امت حرام ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ جن کو حضرات غیر مقلدین بھی امام مانتے ہیں، انہوں نے اپنے فتاویٰ میں اس پر اجماع امت کا دعویٰ کیا ہے کہ اپنی نفسانی خواہش کے مطابق سمجھ کر بغرض اتباع ہوا کسی حدیث یا کسی امام کے مذہب کو اختیار کرنا حرام ہے۔

مقلدین ان سے اس کی توقع رکھیں کہ ان کی طرف سے بھی وہی توجیہ قبول کر لی جائے۔

ایک مسئلہ فقہیہ

اسی کی نظیر ایک مسئلہ فقہیہ بھی ہے کہ سبع قرأت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر منقول ہیں، ساتوں قرأتوں میں قرآن کا پڑھنا ہمیشہ معمول رہا ہے لیکن شارح منیہ علامہ حلبیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ زمانہ جہل و نادانی کا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ بجز اس قرأت کے جو اپنے ملک میں رائج ہو دوسری قرأت نہ پڑھی جائے، تا کہ عوام اس مغالطہ میں نہ پڑ جائیں کہ قرآن کے الفاظ میں اختلافات ہیں۔ (جواہر الفقہ ۲/۲۷۷)

تقلید شخصی کب سے شروع ہوئی اور کیوں ہوئی؟

قرون مشہود لها بالخیر یعنی زمانہ صحابہ و تابعین میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے جو شخص کسی مسئلہ سے واقف نہ ہوتا تھا وہ کسی عالم سے مسئلہ پوچھ کر اس کی تقلید کر کے عمل کرتا تھا اور اس میں تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں کے نظائر اس عہد مبارک میں ملتے ہیں، تقلید غیر شخصی کا چونکہ حضرات اہل حدیث بھی اقرار کرتے ہیں اس لیے ان کے نظائر جمع کرنے کی ضرورت نہیں صرف وہ چند واقعات لکھے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صحابہ و تابعین میں بھی بعض لوگ تقلید شخصی کے پابند تھے، اور کسی ایک ہی عالم کو اپنا مقتدا بنایا ہوا تھا۔ تمام مواضع خلاف میں ان کے مذہب کو رائج سمجھ کر اسی پر عمل کرتے ہیں۔

محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں تحریر فرماتے ہیں: اختلاف فی کثیر من الاحکام و اتباعہ فی ذلک أصحابہ من اہل مکہ۔ محل خلاف میں ابن عباسؓ کے قول کو ترجیح دینا اور ان کے فتویٰ پر عمل کرنا یہی

تقلید شخصی ہے۔

نیز حجۃ اللہ ہی میں فرماتے ہیں: وکان ابراہیم وأصحابہ یرون ابن مسعودؓ وأصحابہ أثبت الناس فی الفقہ۔

یعنی حضرت ابراہیم خنیؓ اور ان کے تلامذہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ کوفہ میں اثبت الناس سمجھتے، محل خلاف میں انہیں کے قول کو ترجیح دیتے تھے اور تقلید شخصی کا کوئی اس سے زائد مفہوم نہیں۔

اور ابو داؤد و مجتبائی ص: ۶۸ میں ہے: عن عمرو بن میمون قال: قدم علينا معاذ باليمن رسول رسول الله إلى قوله فألقيت محبتي عليه فما فارقتہ حتى دفنته بالشام ميتا ثم نظرت إلى أفعه الناس بعده فاتيت ابن مسعودؓ فلزمته حتى مات الحديث۔

یعنی عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ جب معاذ بن جبلؓ یمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہو کر تشریف لائے تو میں نے ان سے محبت کی اور اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک کہ ان کو شام میں دفن کر لیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اب افقہ الناس کون ہے، تو حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آیا اور ان کی خدمت میں رہا یہاں تک کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

الحاصل تقلید زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئی، آپ کے حکم سے ہوئی اور پھر صحابہ میں ہمیشہ رہی، بعض حضرات نے مطلق تقلید سے کام لیا بعض نے تقلید شخصی سے۔ باقی رہا آپ کا یہ سوال تقلید کیوں ہوئی؟ تو اول تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا امر فرمایا جمہور صحابہ نے اس پر عمل کیا تو پھر ایک مسلمان کے لیے اس سوال کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ ”کیوں ہوئی“ علاوہ بریں اس کی حکمت کچھ مخفی بھی نہیں کیونکہ تقلید کا حال علوم دینیہ میں بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ علوم

باب الخلاف وطرقه، ولما کثر تشعب الاصطلاحات فی العلوم ولما عاق عن الوصول إلى رتبة الاجتهاد ولما خشی من اسناد ذلک إلى غیر اہلہ ومن لا یوثق برأیہ ولا بدینہ فصرحوا بالعجز والأعواز وردوا الناس إلى تقلید هؤلاء کل من اختص به من المقلدین وحظروا أن يتداول تقلیدهم لما فیہ من التلاعب ولم یبق إلا نقل مذاهبهم وعمل کل مقلد بمذهب من قلده منهم بعد تصحیح الأصول والاتصال بسندھا بالروایة، ولا محصول الیوم للفقہ غیرھا أو مدعی الاجتهاد لهذا العهد مردود علی عقبیہ مہجور تقلیدہ وقد صار أهل الإسلام الیوم علی تقلید هؤلاء الأئمة الأربعة انتھی کلامہ.

اور شیخ ابن ہمام فتح القدر میں فرماتے ہیں: انعقد الإجماع علی عدم العمل بالمذاهب المخالفة للأئمة الأربعة۔
اور علامہ ابن حجر مکی فتح المبین شرح الاربعین میں فرماتے ہیں أما فی زماننا فقال أئمتنا لا یجوز تقلید غیر الأئمة الأربعة الشافعی ومالک وأبی حنیفة وأحمد بن حنبل۔

اور طحاوی حاشیہ درمختار میں فرماتے ہیں من کان خارجا عن هذه الأربعة فهو من أهل البدعة۔

اب کسی کا اس پر یہ دلیل طلب کرنا کہ تقلید چار میں کیوں منحصر ہوگئی، محض بے محل ہے اور بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص کے اولاد کثیر ہو لیکن وہ مرتے رہیں، یہاں تک کہ جب باپ کا انتقال ہو تو چار بیٹوں کے سوا اور کوئی باقی نہ رہے، اب ظاہر ہے کہ تقسیم میراث انہیں چاروں میں منحصر ہوگئی، حالانکہ اولاد ان کے سوا اور بھی تھی، لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے نہ سنا ہوگا کہ میراث انہیں چار میں کیوں منحصر ہوگئی۔ اور جو کوئی کہے تو اس کا جواب

دنیویہ طب وریاضی و ہیئت کا اور دست کاریوں مثل نجاری و معماری وغیرہ کا کہ ناواقف کو ان سب میں بدون تقلید کسی واقف کے چارہ نہیں، ایسے ہی علوم دینیہ میں ناواقف کو بدون تقلید واقف کے چارہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (جواہر الفقہ ۲/۲۸)

تقلید صرف ائمہ اربعہ ہی کی کیوں کی جاتی ہے؟

(۳) تقلید صرف ائمہ اربعہ ہی کی کیوں کی جاتی ہے کیا کوئی دوسرا امام اس درجہ کا نہیں ہوا جس کی تقلید کی جائے، اور کیا ائمہ اربعہ کی تقلید کا حکم کسی نص میں وارد ہوا ہے؟ ائمہ اربعہ پر سلسلہ تقلید ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں بلکہ محض اتفاقی ہے کہ مشیت خداوندی سے ان چار مذاہب کے سوا اور جتنے مذاہب تھے مندرس ہو گئے اور مٹ کر کان لم یکن ہو گئے، دو، چار، دس، بیس یا پچاس، سو، اقوال و احکام اگر آج ان کے منقول و موجود بھی ہوں تو وہ کوئی مستقل مذہب نہیں بن سکتا کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں، کیونکہ اگر ان سو پچاس احکام میں ان کی تقلید کر بھی لی تو باقی ہزاروں مسائل میں کیا کریں گے۔

اب جب کہ دیکھا گیا کہ کل مذاہب سوائے ان چار مذہبوں کے مندرس ہو گئے تو ناچار سلسلہ تقلید انہیں میں منحصر ہو گیا۔

چنانچہ ابن خلدون اپنے مقدمہ تاریخ میں ظاہر یہ کہ مذہب پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثم درس مذهب أهل الظاهر اليوم بدروس أئمتہ وإنکار الجمهور علی منتحلیہ ولم یبق إلا فی الكتب المجلدة۔

اور اسی تاریخ ابن خلدون میں یہ بھی مصرح ہے کہ ووقف التقليد فی الأمصار عند هؤلاء الأربعة ودرس المقلدون لمن سواهم وسد الناس

ہندوستان و پاکستان میں مسلک حنفی کی تخصیص

بلکہ علمائے امت نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہندوستان میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید متعین ہے، کیونکہ ہندوستان میں عام طور سے حنفیہ ہی کی کتابیں ملتی ہیں، اور عالم بھی حنفیہ ہی ہیں اس وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے سوا دوسرے امام کی تقلید کرنا اہل ہندوستان کو مناسب نہیں ہے۔

تفصیل اس مضمون کی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حجتہ اللہ البالغہ اور انصاف و عقد الجید میں تحریر فرمائی۔ (فتاویٰ دارالعلوم قدیم ۷/۳۳۷)

مسئلہ تقلید و اجتہاد پر جو کچھ لکھا گیا وہ اس مسئلہ کا بہت مختصر خلاصہ ہے جو عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ عالمانہ تحقیقات و تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل موجود ہیں، خصوصاً کتاب الموافقات علامہ شاطبی جلد رابع باب الاجتہاد، اور علامہ سیف الدین آمدی کی کتاب احکام الاحکام جلد ثالث، القاعدة الثالثة في المجتہدين۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی کتابیں حجتہ اللہ البالغہ، اور رسالہ عقد الجید اور آخر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب الاقتصاد في التقليد والاجتہاد اس مسئلہ میں خاص طور سے قابل دید ہیں۔ اہل علم ان کی طرف مراجعت فرمائیں۔ (معارف القرآن ۵/۳۳۶، نجل)

اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بھائی مشیت ایزدی یہی تھی۔

ملا جیون صاحبؒ نے تفسیر احمدی میں لکھا ہے والانصاف أن انحصار المذاهب في الأربع فضل إلهي وقبولية من عند الله لا مجال فيه للتوجيهات والأدلة. انتھی۔

باقی رہا آپ کا یہ فرمانا کہ کونسی آیت قرآن و حدیث نبوی ان کے نام وارد ہوئی سو یہ ایک عجیب سوال ہے۔ احکام شرع نام بنام وارد نہیں ہوا کرتے ورنہ پھر یہ بتلائیے کہ کونسی آیت قرآنی و حدیث نبوی آپ کے نام سے وارد ہوئی ہے کہ آپ کو روٹی کھانا اور کپڑا پہننا جائز ہے۔ کونسی آیت میں آپ کا نام لے کر یہ بتلایا ہے کہ آپ کو سونا اور اٹھنا بیٹھنا جائز ہے۔ اگر ثبوت احکام میں نام بنام آیت کی ضرورت ہوا کرے تو انشاء اللہ دنیا میں آج نہ کسی پر کوئی چیز فرض و واجب رہے گی اور نہ حرام و مکروہ کونسی آیت یا حدیث آپ دکھلائیں گے جس میں آپ کا نام لے کر آپ پر نماز واجب کی گئی ہو۔

اسی طرح مثال مذکور میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چار بیٹوں کو جو میراث دی گئی ہے کونسی آیت یا حدیث ان کے نام بنام وارد ہوئی ہے۔ ہرگز نہیں، البتہ حکم عام سب کے لیے موجود ہے، سو وہ دربارہ تقلید ائمہ بھی موجود ہے جیسا کہ اوپر گذرا مثل قول باری تعالیٰ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ کیونکہ ائمہ اربعہ بلا شک اہل ذکر میں سے ہیں۔ (جواہر الفقہ ۲/۳۲۲)

ائمہ اربعہ کی تقلید میں انحصار کیوں؟

چوتھی صدی ہجری میں جب کہ ائمہ مجتہدین ختم ہو گئے، تو تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ ائمہ اربعہ کی تقلید کی جائے۔ اس لیے کہ مذاہب اربعہ ہی کی کتابیں مدون ہوئیں اور کسی مذہب کی کتب مدون نہیں ہوئیں۔

(فتاویٰ دارالعلوم قدیم ۷/۳۷۷)

لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجے میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے تو اس گالی دینے والے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود گالی دی۔

اسی معاملہ کی ایک دوسری مثال عہد رسالت میں پیش آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بیت اللہ شریف زمانہ جاہلیت کے کسی حادثہ میں منہدم ہو گیا تھا، تو قریش مکہ نے بعثت نبوت سے پہلے اس کی تعمیر کرائی، اس تعمیر میں چند چیزیں بناء ابراہیم کے خلاف ہو گئیں ایک تو یہ کہ جس حصہ کو حطیم کہا جاتا ہے یہ بھی بیت اللہ کا جز ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا۔ دوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے شرقی اور غربی تھے، ایک داخل ہونے کے لیے دوسرا باہر نکلنے کے لیے اہل جاہلیت نے غربی دروازہ بند کر کے صرف ایک کر دیا اور وہ بھی سطح زمین سے بلند کر دیا تا کہ بیت اللہ شریف میں دخول صرف ان کی مرضی و اجازت سے ہو سکے، ہر شخص بے محابانہ جاسکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنادوں مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عام عرب ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو منہدم کرنے سے کہیں ان کے دل میں کچھ شبہات نہ پیدا ہو جائیں، اس لیے میں نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا، ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو بناء ابراہیمی کے مطابق بنانا، ایک طاعت اور کارِ ثواب تھا مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرہ کا ترتیب دیکھ کر آپ نے اس ارادہ کو ترک فرما دیا۔

اس واقعہ سے بھی یہی اصول مستفاد ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی مفسدہ لازم آتا ہے تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے۔

باب ۸ اصولی مباحث و فقہی قواعد

معصیت کا ذریعہ اور سبب بھی معصیت ہے

جس امر محمود و مندوب سے فساد لازم آئے اس کا ترک ضروری ہے

”وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ“۔ (انعام ۷)

اس آیت سے چند اصولی مسائل نکل آئے۔

مثلاً ایک اصول یہ نکل آیا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو یا اس کے نتیجے میں لوگ مبتلاءِ معصیت ہوتے ہوں، تو وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے کیونکہ معبودانِ باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضے سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس برائی کا سبب بن جائیں گے اس لیے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔ اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے فرمایا کہ ہاں انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا

قاعدہ مذکورہ کے شرائط اور اس کے حدود

لیکن اس پر ایک قوی اشکال ہے جس کو روح المعانی میں ابو منصور سے نقل کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد و قتال لازم فرمایا ہے حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا، تو وہ مسلمان کو قتل کریں گے، اور مسلمان کا قتل کرنا حرام ہے، تو اس اصول پر جہاد بھی ممنوع ہو جانا چاہئے ایسے ہی ہماری تبلیغ اسلام اور تلاوت قرآن پر نیز اذان اور نماز پر بہت سے کفار مذاق اڑاتے اور مضحکہ بناتے ہیں، تو کیا ہم ان کی اس غلط رویہ کی بنا پر اپنی عبادت سے دستبردار ہو جائیں؟

اس کا جواب خود ابو منصور نے یہ دیا ہے کہ یہ اشکال ایک ضروری شرط کے نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام جس کو لزوم مفسدہ کی وجہ سے منع کر دیا گیا ہے، اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہوں جیسے معبودان باطلہ کو برا کہنا اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں اسی طرح بیت اللہ کی تعمیر کو بناء ابراہیمی کے مطابق بنانا اس پر بھی کوئی اسلامی مقصد موقوف نہیں، اس لیے جب اس پر کسی دینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہوا تو ان کاموں کو ترک کر دیا گیا اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں، یا کوئی مقصد اسلامی اس پر موقوف ہے اگر دوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ اور خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے، بلکہ اس کی کوشش کی جائے کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہے، اور پیش آنے والے مقاصد جہاں تک ممکن ہو بند ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ دونوں حضرات ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کے لیے چلے، وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے اس کو دیکھ کر ابن سیرین واپس ہو گئے مگر حسن بصریؒ نے فرمایا کہ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے ہم اپنے

ضروری کام کیسے چھوڑ دیں، نماز جنازہ فرض ہے اس کو اس مفسدہ کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا، ہاں اس کی کوشش تا بمقدور کی جائے گی کہ یہ مفسدہ مٹ جائے۔ (یہ واقعہ بھی روح المعانی میں نقل کیا گیا ہے)۔

خلاصہ اصول

اس لیے خلاصہ اس اصول کا جو آیت مذکور سے نکلا ہے یہ ہو گیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ سے نہ ہو، اگر اس کے کرنے پر کچھ مفسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہو جاتا ہے بخلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لازم مفسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔

تفصیلات: اس اصول سے فقہاء امت نے ہزاروں مسائل کے احکام نکالے ہیں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کا بیٹا نافرمان ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لیے کہوں گا تو انکار کر دے گا اور اس کے خلاف کرے گا، جس سے اس کا سخت گنہگار ہونا لازم آئے گا، تو ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو حکم کے انداز میں کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے کو نہ کہے بلکہ نصیحت کے انداز میں اس طرح کہے کہ فلاں کام کر لیا جائے، تو بہت اچھا ہوتا کہ انکار یا خلاف کرنے کی صورت میں ایک جدید نافرمانی کا گناہ اس پر عائد نہ ہو جائے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ)

اسی طرح کسی کو وعظ و نصیحت کرنے میں بھی اگر قرآن سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی ایسا غلط انداز اختیار کرے گا جس کے نتیجہ میں وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہو جائے گا، تو ایسی صورت میں نصیحت ترک کر دینا بہتر ہے۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے:

باب من ترک بعض الاختیار مخافة ان یقصر فہم بعض الناس

سد ذرائع کا قاعدہ

”وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ“ (سورہ بقرہ، پ ۱)

یعنی اس درخت کے قریب نہ جاؤ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ مگر احتیاطی حکم دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اس سے اصول فقہ کا مسئلہ سد ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا، تو اس ناجائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا، اس کے پھل پھول کھانے کا اس ذریعہ کو بھی منع فرمایا گیا اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں سد ذرائع ہے۔ (معارف القرآن ۱۹۵/۱)

سد ذرائع کے قاعدہ کی تفصیل

جس طرح اصول عقائد توحید، رسالت، آخرت تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں، اسی طرح عام معاصی اور فواحش و منکرات ہر شریعت و مذہب میں حرام قرار دیئے گئے ہیں لیکن شرائع سابقہ میں ان کے اسباب و ذرائع کو مطلقاً حرام نہیں کیا گیا جب تک کہ ان کے ذریعہ کوئی جرم واقع نہ ہو جائے شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام چونکہ قیامت تک رہنے والی شریعت تھی اس لیے اس کی حفاظت کا منجانب اللہ خاص اہتمام یہ کیا گیا کہ ذرائع معاصی تو حرام تھے ہی ان اسباب و ذرائع کو بھی حرام قرار دے دیا گیا جو عادت غالبہ کے طور پر ان جرائم تک پہنچا دینے والے ہیں، مثلاً شراب نوشی کو حرام کیا گیا، تو شراب کے بنانے بیچنے خریدنے اور کسی کو دینے کو بھی حرام قرار دے دیا گیا، سود کو حرام کرنا تھا تو سود سے ملتے جلتے معاملات کو بھی ناجائز کر دیا گیا اسی لیے حضرات فقہاء نے تمام معاملات فاسدہ سے

فیقعوا فی اشد منہ۔ یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم عوام کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے بشرطیکہ یہ کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہو، مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہے خواہ فرائض و واجبات ہو یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں، تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی ابتداء اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز و تلاوت و تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکین مکہ کو اشتعال ہوتا تھا مگر اس کی وجہ سے ان شعائر اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا بلکہ خود آیت مذکورہ کے شان نزول میں جو واقعہ ابو جہل وغیرہ رؤساء قریش کا ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں یہ کام کسی حال میں نہیں کر سکتا اگرچہ وہ آفتاب و مہتاب لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

تنقیح اور خلاصہ

اس لیے اس مسئلہ کی تنقیح اس طرح ہوگی کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کے کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا۔ ہاں جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں اور ان کے ترک کر دینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا، ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے گا۔

(معارف القرآن ص: ۴۲۱ تا ۴۲۴، سوم، سورہ انعام)

شریعت اسلام نے اصل معصیت کے ساتھ ملحق کر کے ان کو بھی حرام کر دیا اور جو اسباب بعیدہ ہیں کہ ان کے عمل میں لانے سے معصیت میں مبتلا ہونا عادتاً لازم و ضروری تو نہیں مگر کچھ نہ کچھ دخل معصیت میں ضرور ہے ایسے اسباب و ذرائع کو مکروہ قرار دیا۔

اور جو اسباب ان سے بھی زیادہ ابعد ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ و نادر ہے ان کو نظر انداز کر کے مباحات میں داخل کر دیا، پہلے مسئلہ کی مثال شراب فروشی ہے کہ یہ شراب نوشی کا سبب قریب ہے اس کو بھی شریعت نے اسی طرح حرام کر دیا جس طرح شراب نوشی حرام ہے، کسی غیر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا اگرچہ عین زنا نہیں مگر اس کا سبب قریب ہے۔ شریعت نے اس کو اسی طرح حرام قرار دے دیا۔

اور دوسرے مسئلہ کی مثال یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ انگور فروخت کرنا جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اس سے شراب ہی بناتا ہے اس کا پیشہ یہی ہے یا اس نے صراحتاً کہہ دیا ہے کہ میں اس کام کے لیے خرید رہا ہوں یہ اگرچہ شراب فروشی کے درجہ میں حرام تو نہیں مگر مکروہ و ناجائز یہ بھی ہے، یہی حکم سنیمہا گھر بنانے یا سودی بینک چلانے کے لیے زمین مکان کرایہ پر دینے کا ہے کہ معاملہ کے وقت جب معلوم ہو کہ یہ اس مکان کو ناجائز کام کے لیے لے رہا ہے تو یہ کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے۔

تیسرے درجہ کی مثال یہ ہے کہ عام لوگوں کے ہاتھ انگور فروخت کئے جائیں جن میں یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے شراب کشید کرے (بنائے) مگر نہ اس نے اس کا اظہار کیا نہ ہمارے علم میں وہ ایسا شخص ہے جو شراب کشید کرتا ہے تو شرعاً اس طرح کی بیع و شراء مباح و جائز قرار دی۔ (معارف القرآن ۲۰۶/۷)

ضروری تنبیہ

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے جن کاموں کو گناہ کا

حاصل ہونے والے نفع کو سود کی طرح مال غنیمت قرار دیا۔ شرک و بت پرستی کو قرآن نے ظلم عظیم ناقابل معافی جرم قرار دیا تو ان کے اسباب و ذرائع پر بھی کڑی پابندی لگا دی، آفتاب کے طلوع و غروب اور وسط میں ہونے کے اوقات میں چونکہ مشرکین آفتاب کی پرستش کرتے تھے ان اوقات میں نماز پڑھی جاتی تو آفتاب پرستوں کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہو جاتی پھر یہ مشابہت کے وقت خود شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتی تھی اسی لیے شریعت نے ان اوقات میں نماز اور سجدہ کو بھی حرام اور ناجائز کر دیا بتوں کے مجسمات و تصویریں چونکہ بت پرستی کا قریب ذریعہ تھیں، اس لیے بت تراشی اور تصویر سازی کو حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کر دیا گیا، اسی طرح جب کہ شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا تو اس کے تمام اسباب قریبہ و ذرائع کو بھی محرمات میں داخل کر دیا کسی اجنبی عورت یا امرد پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا قرار دیا۔ اس کا کلام سننے کو کانوں کا اس کے چھونے کو ہاتھ کا اس کے لیے جد و جہد میں چلنے کو پاؤں کا زنا فرمایا، جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے انہیں جرائم سے بچانے کے لیے عورتوں کے واسطے پردہ کے احکام نازل ہوئے۔ (معارف القرآن ۲۰۶/۷، اجزاب)

سد ذرائع کے حدود

مگر اسباب و ذرائع کا قریب و بعید ایک طویل سلسلہ ہے اگر دور تک اس سلسلے کو روکا جائے تو زندگی دشوار ہو جائے اور علم میں بڑی تنگی پیش آ جائے، جو اس شریعت کے مزاج کے خلاف ہے قرآن کریم کا اس کے بارے میں کھلا ہوا اعلان یہ ہے کہ:

”مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ“ یعنی دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالی گئی، اس لیے اسباب و ذرائع کے معاملے میں یہ حکیمانہ فیصلہ کیا گیا کہ جو افعال و اعمال کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہو کہ عام عادت کے اعتبار سے اس کا ارتکاب کرنے والا اسی معصیت میں ضرور ہی مبتلا ہو جاتا ہے ایسے اسباب قریبہ کو

اسی سبب للمعصیت پر مبنی ہے ”ولا تخضعن بالقول“ کی نہیں بھی اسی پر وارد ہے اگرچہ یہ ظاہر ہیکہ ان تمام امور میں معصیت کے قصد و نیت کا دور کا بھی احتمال نہیں لیکن یہاں ایک اہم بات قابل غور یہ ہے کہ تسبب ایک ایسا وسیع لفظ ہے جس میں سارے مباحات آجاتے ہیں اگر تسبب کے مفہوم کو مطلقاً سببیت کے لیے عام رکھا جائے تو شاید دنیا کا کوئی مباح کام بھی مباح اور جائز نہیں رہے گا، زمین سے غلہ و پھل اگانے والا اس کا بھی سبب بنتا ہے کہ اس غلہ اور ثمرات سے اعداء اللہ کو نفع پہنچے کپڑا بنانا، مکان بنانا، ظروف و استعمالی چیزیں بنانا ان سبب میں بھی یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک بر و فاجر ان کو خریدتا اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے۔ اور سبب اس کا ان چیزوں کا بنانے والا ہوتا ہے اگر اس طرح حرمت کو عام کیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی کام بھی جائز نہ رہے۔ (جواہر الفقہ ص: ۴۵۳ ج: ۲، قدیم)

سبب قریب و بعید کی تفصیل

اس لیے ضروری ہے کہ سبب قریب و بعید کا فرق کیا جائے سبب قریب ممنوع اور سبب بعید مباح ہو، مذکورہ امثلہ میں سے سبب بعید کی مثالیں ہیں اس لیے وہ جائز رہیں گی، پھر سبب قریب کی بھی دو قسمیں ہیں ایک سبب جالب و باعث جو گناہ کے لیے متحرک ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو صدور معصیت کے ہونے کی کوئی ظاہری وجہ نہ تھی، ایسے سبب کا ارتکاب گویا معصیت ہی کا ارتکاب ہے۔ علامہ شاطبی نے موافقات جلد اول کے مقدمہ میں ایسے ہی اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ ”ایقاع السبب ایقاع المسبب“ نص قرآنی میں جہاں تسبب کو حرام قرار دیا ہے کہ سبب المشرکین یا عورتوں کے لیے ضرب ارجل یا قنوع بالقول یا تبرج جاہلیت، یہ سبب اسی قسم کے اسباب ہیں کہ معصیت کی تحریک کرنے والے اور جالب و باعث ہیں۔ ایسے اسباب کا ارتکاب

سبب قریب درجہ اول کا قرار دے کر حرام کر دیا اس حکم حرمت کے بعد وہ سب کے لیے مطلقاً حرام ہے، خواہ ابتلاء گناہ کا سبب بنے یا نہ بنے، اب وہ خود ایک حکم شرعی ہے جس کی مخالفت حرام ہے۔ (معارف القرآن ۲۰۷/۷)

اعانت علی المعصیت کے حدود

اعانت علی المعصیت اور تسبب للمعصیۃ کے مختلف درجات ہیں اور اسی وجہ سے احکام بھی مختلف ہیں۔ مختصر خلاصہ یہ ہے کہ کسی معصیت کی اعانت جواز روئے قرآن حرام ہے، وہ ہے جس میں معصیت کا مقصد و نیت حقیقۃً یا حکماً شامل ہو حقیقۃً یہ کہ دل میں یہ ہو کہ اس کے ذریعہ عمل معصیت کیا جائے، یا یہ کہ صلب عقد میں احد المتعاقدین کی طرف سے اس معصیت کی تصریح آجائے۔

اور حکماً یہ ہے کہ وہ چیز بجز معصیت کے کسی دوسرے کام میں آتی ہی نہ ہو جیسے آلات معارف، طبلہ، سارنگی اور مختلف قسم کے آلات و موسیقی ان چیزوں کا بنانا اور بیچنا اگرچہ مقصد معصیت نہ ہو مگر حکماً وہ بھی قصد معصیت میں داخل ہے، اور جہاں کسب معصیت نہ حقیقۃً ہو نہ حکماً وہ اعانت علی المعصیت میں داخل نہیں۔

(جواہر الفقہ ۲/۴۵۳ قدیم)

تسبب للمعصیۃ کے حدود

البتہ اعانت سے ملتی جلتی ایک اور چیز ہے جس کو اصطلاح میں تسبب کہتے ہیں، وہ بھی از روئے نص قرآن حرام ہے خواہ ہیئت معصیت ہو یا نہ ہو، مثلاً سبب المشرکین کی نص قرآنی میں ممانعت اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ وہ سبب ہوتی ہے سبب حق کے لیے۔ اسی طرح کسی کے ماں باپ کو گالی دینا حدیث میں اپنے ماں باپ کو گالی دینا اسی تسبب کی بنا پر قرار دیا گیا ”وَلَا يَضْرِبَنَّ بَارُ جُلْهِنَّ ضَرْبَ الرَّجْلِ لِلنِّسَاءِ“ کی ممانعت

معصیت ہی کا ارتکاب سمجھا جاتا ہے، اس لیے باتفاق حرام ہیں۔

سبب قریب کا حکم

ایسے اسباب معصیت کا ارتکاب گویا خود معصیت ہی کا ارتکاب ہے، اس لیے معصیت کی نسبت اس شخص کی طرف کی جائے گی جس نے اس کے سبب کا ارتکاب کیا کسی فاعل مختار کے درمیان حائل ہونے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث میں دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینے والے کے حق میں اپنے والدین کو گالی دینے والا کہا گیا ہے کیونکہ ایسا تسبب للمعصیت بنص قرآنی و حدیث خود ایک معصیت ہے۔

سبب قریب کی دوسری قسم

دوسری قسم سبب قریب کی وہ ہے کہ بنے تو سبب قریب مگر معصیت کے لیے متحرک نہیں بلکہ صدور معصیت کسی دوسرے فاعل مختار کے اپنے فعل سے ہوتا ہے جیسے ”بیع عصیر عنب ممن یتخذہ خمراً“ یا ”اجارۃ ممن یتعبد فیہا الاصلنام“ وغیرہ کو یہ بیع و اجارہ اگرچہ ایک حیثیت سے سبب قریب ہے معصیت کا مگر جالب اور محرک للمعصیہ نہیں شیرہ انگور خریدنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو شراب ہی بنائے اور گھر کو کسی مشرک کے لیے کرایہ پر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اسی میں بت پرستی بھی کرے، بلکہ وہ اپنی خباثت یا جہالت سے اس گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ شیرہ بیچنے والا یا مکان کرایہ دینے والا معصیت کا باعث اور محرک نہیں ہے، ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد اس معصیت کا ہو تب تو یہ خود ارتکاب معصیت اور اعانت معصیت میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہے اور اگر اس کا قصد و نیت شامل نہ ہو تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کو علم بھی نہ ہو کہ یہ شخص شیرہ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا،

یا شراب یا گھر کرایہ پر لے کر اس میں صرف سکونت کرے گا، یا کوئی ناجائز کام فسق و فجور کا کرے گا۔ اس صورت میں یہ بیع و اجارہ بلا کراہت جائز ہے۔

اور اگر اس کو علم ہے کہ یہ شخص شیرہ انگور خرید کر شراب بنائے گا یا مکان کرایہ پر لے کر فسق و فجور کرے گا یا سودی کاروبار کرے گا یا جاریہ کو خرید کر اس کو گانے کے کام میں لگائے گا، یا امر و کفر خرید کر اس سے سیاہ کاری میں مبتلا ہوگا یا لوہا خرید کر مسلمانوں کے خلاف استعمال کرے گا۔ اس صورت میں یہ بیع و اجارہ مکروہ ہے۔ (جواہر الفقہ ص: ۴۵۵ ج: ۲، قدیم)

امام صاحب و صاحبین کا اختلاف

اسی صورت میں حضرت امام صاحب و صاحبین کا اختلاف منقول ہے مگر اس میں جو امام صاحب کی طرف قول جواز منقول ہے اس کا وہی مطلب ہے جو سوال میں بحوالہ خلاصۃ الفتاویٰ نقل کیا ہے، اب اگر حضرات صاحبین اس عقد ہی کو جائز قرار نہیں دیتے تو اختلاف حقیقی ہو گیا کہ ان کے نزدیک عقد ہی درست نہیں اور متعاقدین کے لیے بیع و ثمن میں تصرف حلال نہیں اور امام صاحب کے نزدیک عقد درست مگر گناہ ہے، اور اگر صاحبین کا قول عدم جواز کا حاصل بھی صرف ارتکاب گناہ ہے فساد عقد نہیں، تو پھر یہ اختلاف صرف لفظی ہوگا کہ صاحبین نے ناجائز قرار دیا بمعنی الاثم والمعصیت اور امام صاحب نے جائز قرار دیا بمعنی جواز عقد نہ کہ بمعنی رفع اثم۔ (جواہر الفقہ ص: ۴۵۵ ج: ۲، قدیم)

کراہت تنزیہی و تحریمی کا مدار

پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو بغیر کسی تغیر اور تصرف کے دوسرے یہ کہ کچھ تصرف تغیر کے بعد وہ معصیت کے کام میں آئے پہلی صورت مکروہ تحریمی ہے۔

مباح اور مندوب کے ناجائز ہونے کا قاعدہ

اس بحث کو علامہ شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں بہت مفصل لکھا ہے اور ایک مستقل فصل اس پر منعقد کی ہے کہ بعض چیزیں اپنی ذات سے جائز بلکہ مندوب ہوتی ہیں لیکن آئندہ کو ان سے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ باعث منکرات بن جائیں گی تو ان کو بھی ترک کرنا چاہئے۔

ولفظہ قد یكون العمل مشروعاً ولكنه یصیر جاریاً مجری البدعة من باب الذرائع ثم ساق له دلائل من الحديث ما فیہ مقنع فلیراجع۔

(کتاب الاعتصام ۹۲/۲)

مثلاً لڑکی والے کی طرف سے دعوت کا اہتمام اگر خود منکرات پر مشتمل نہ ہو مگر دوسرے لوگوں کے لیے ذریعہ بننے کا اندیشہ ہو تب بھی ایسی دعوتوں کو ترک کرنا چاہئے۔

(فتاویٰ دارالعلوم قدیم ۲۰۰/۷)

جلب منفعت و دفع مضرت کا قاعدہ

وَإِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (بقرہ) یعنی شراب و قمار کے مفاسدان کے نفع سے زیادہ ہیں، اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جس سے ایک اہم نتیجہ یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں ورنہ یوں تو دنیا کی کئی بری سے بری چیز بھی منافع سے خالی نہیں زہر قاتل میں سانپ اور بچھو میں درندوں میں کتنے فوائد ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ان کو مضر کہا جاتا ہے اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفاسدان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے۔

دوسری مکروہ تنزیہی فتاویٰ قاضی خان اور دوسری کتب فقہ کی عبارتوں میں جو کراہت تحریم و تنزیہ کا اختلاف نظر آتا ہے اس کی تطبیق بھی اس تفصیل سے ہو جاتی ہے۔
فلله الحمد۔ (جواہر الفقہ ۲/۲۵۶)

کسی جائز فعل سے اگر دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش

ہو تو وہ جائز فعل بھی ناجائز ہو جاتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا . (سورۃ بقرہ پ: ۱)

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر اپنے کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی اس کے لیے جائز فعل نہیں رہتا۔

جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کو مغالطہ میں پڑ جانے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کے لیے یہ جائز فعل بھی ممنوع ہو جائے گا، بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اس کی مثال قرآن و سنت میں بہت ہیں، اس کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کی تعمیر جو قریش نے زمانہ جاہلیت میں کی تھی اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمی کے خلاف کردی ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کو منہدم کر کے از سر نو بناء ابراہیمی کے مطابق بنادوں۔ لیکن اس سے ناواقف لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے اس لیے بالفعل ایسا نہیں کرتا ایسے احکام کو اصول فقہ کی اصطلاح میں سد ذرائع سے تعبیر کیا جاتا ہے جو سبھی فقہاء کے نزدیک معتبر ہے۔ خصوصاً حضرات حنابلہ اس کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

(قرطبی، معارف القرآن ۲۸۱/۱)

اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حرمت؟

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (پ، سورہ بقرہ)

اس آیت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسان کے لیے حلال و مباح ہوں کیونکہ وہ اس کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ بجز ان چیزوں کے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا اس لیے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن و سنت سے ثابت نہ ہو، اس کو حلال سمجھا جائے گا۔ اس کے بالمقابل بعض علماء نے یہ قرار دیا کہ انسان کے فائدے کے لیے کسی چیز کے پیدا ہونے سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لیے اصل اشیاء میں حرمت ہے جب تک قرآن و سنت کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو ہر چیز حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے توقف فرمایا۔ تفسیر بحر محیط میں ابن حیان نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اقوال مذکورہ میں کسی کے لیے حجت نہیں کیونکہ خَلَقَ لَكُمْ میں حرف لام سمیت بتلانے کے لیے آیا ہے کہ تمہارے سبب سے یہ چیزیں پیدا ہو گئی ہیں اس سے نہ انسان کے لیے ان چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ حرام ہونے پر بلکہ حلال و حرام کے احکام جدا گانہ قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں، انہیں کا اتباع لازم ہے۔ (معارف القرآن ۱۷/۱)

محقق قول

كُلُوا وَاشْرَبُوا۔ (پ، سورہ اعراف)

ایک مسئلہ اس آیت سے احکام القرآن بصاص کی تصریح کے مطابق یہ نکلا کہ دنیا میں جتنی چیزیں کھانے پینے کی ہیں اصل ان میں یہ ہے کہ وہ سب جائز و حلال ہیں،

چوری، ڈاکہ، زنا، اغواء، دھوکہ، فریب وغیرہ تمام جرائم میں کون سا جرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان ان کے پاس نہ جاتا حالانکہ اب سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقل مندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ کچھ تمام جرائم میں ہیں مگر چونکہ ان کی مضرت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے اس لیے کوئی عقلمند انسان ان کو مفید اور جائز نہیں کہتا شریعت اسلام نے شراب اور جوئے کو اسی اصول کے تحت حرام قرار دیا ہے کہ اس کے فوائد سے زیادہ مفسد اور دینی و دنیوی مضرتیں ہیں۔

(معارف القرآن ۱۷/۱)

مسلمانوں کے مصالح عامہ کی رعایت اور ان کو

غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام

اسی واقعہ نے ہمیں ایک سبق یہ دیا کہ جو کام فی نفسہ جائز درست ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو خود غلط فہمی پیدا ہو گئی یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے گا، تو یہ کام نہ کیا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین ابن ابی کافق کھل جانے کے بعد بھی فاروق اعظم کے اس مشورہ کو قبول نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کیا جائے کیونکہ اس میں خطرہ یہ تھا کہ دشمنوں کو عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بھی قتل کرتے ہیں مگر دوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ غلط فہمی کے خطرہ سے ایسے کاموں کو چھوڑا جاسکتا ہے جو مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو گوسستب و کارثا ہو کسی مقصد شرعی کو ایسے خطرہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا، بلکہ خطرہ کے ازالہ کی فکر کی جائے گی اور اس کام کو کیا جائے گا۔

(معارف القرآن ۱۷/۸)

میں دیدیا پھر کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دیدیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا تو پھر شوہر نے بیوی کو ہبہ کر دیا اس طرح کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسا کرنا چونکہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے اس لیے حرام ہے۔ اور شاید اس کا وبال ترک زکوٰۃ کے وبال سے زیادہ بڑا ہے۔

(روح المعانی از مبسوط سرخسی، معارف القرآن ۵۲۳/۷)

عمدہ کھجور خریدی تو یہاں حکم شرعی کی تعمیل مقصود ہے ابطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض ایسی تدبیریں بتلائی ہیں ان کو یہودیوں کے حیلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

(معارف القرآن ۲۴۳/۱)

حیلہ کے جواز کی شرط اور اس کا معیار

اس آیت (وَ اخْذْ بَبِذِكَ ضَعْفًا - پ ۲۳) سے دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کے لیے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے تو وہ جائز ہے ظاہر ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ اپنی زوجہ مطہرہ کو پوری سوئچیاں ماریں لیکن چونکہ ان کی زوجہ مطہرہ بے گناہ تھیں اور انہوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بے مثال خدمت کی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایوب علیہ السلام کو ایک حیلہ کی تلقین فرمائی۔ اور یہ تصریح کر دی کہ اس طرح ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی اس لیے یہ واقعہ حیلہ کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے حیلے اسی وقت جائز ہوتے ہیں جب کہ انہیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور اگر حیلہ کا مقصود یہ ہو کہ کسی حقدار کا حق باطل کیا جائے یا کسی صریح فعل حرام کو اس کی روح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لیے

جب تک کسی خاص چیز کی حرمت و ممانعت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز کو جائز و حلال سمجھا جائے گا۔ اس کی طرف اشارہ اس بات سے ہوا کہ کُلُّوْا وَاَشْرَبُوْا کا مفعول ذکر نہیں فرمایا کہ کیا چیز کھاؤ، پیو، اور علماء عربیت کی تصریح ہے کہ ایسے موقع پر مفعول کا ذکر نہ کرنا اس کے عموم کی طرف اشارہ ہوا کرتا ہے کہ ہر چیز کھاپی سکتے ہو بجز ان اشیاء کے جس کو بالتصریح حرام کر دیا گیا ہے۔

(احکام القرآن ج ۵ ص ۵۴۵)

حیلہ کا بیان

جائز اور ناجائز حیلہ

اس آیت میں یہودیوں کے جس اعتداء یعنی حدود سے تجاوز کا ذکر کر کے اس کو سبب عذاب بتلایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکم شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دم میں ایک ڈور کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈور زمین پر کسی چیز سے باندھ دی پھر اتوار کے دن اس کو پکڑ کر کھالیا تو وہ ایک ایسا حیلہ ہے جس میں حکم شرعی کا ابطال بلکہ ایک قسم کا استہزاء ہے۔ اس لیے ایسا حیلہ کرنے والوں کو بڑا سرکش نافرمان قرار دے کر ان پر عذاب آیا مگر اس سے ان فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، مثلاً ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دوسیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، دوسیر خراب کھجوریں دودرہم میں فروخت کر دیں پھر ان دودرہموں میں سے ایک سیر عمدہ کھجور خرید لیں مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کے لیے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کے ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت

اور مقوی غذائیں، ایسی حالت کے لیے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے نہ روزہ کا افطار جائز ہوتا ہے مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہو سکیں تو استعمال کرے اور نہ حاصل ہو سکیں تو صبر کرے۔

ذینت: جس سے بدن کی کوئی خاص تقویت بھی نہیں محض تشریح خواہش ہے ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فضول: وہ ہے جو زینت مباح کے دائرہ سے بھی آگے محض ہوس ہو اس کا حکم بھی ظاہر ہے اس لیے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے اس فضول کی مخالفت احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ (جواہر الفقہ ۱/۲۹)

ضرورت و اضطرار کی تفصیل اور اس کا حکم

لفظ ضرورت ہی سے اضطرار ماخوذ ہے ضرورت کے اصطلاحی معنی ابھی معلوم ہو چکے ہیں کہ خطرہ جان کے لیے مخصوص ہے، جس میں جان کی ہلاکت کا خطرہ یقینی نہ ہو، وہ ضرورت و اضطرار میں داخل نہیں بلکہ حاجت میں داخل ہے، خطرہ جان کا یقین ہونا بھی قرآن کریم ہی کے الفاظ سے ثابت ہے، جن مواقع میں قرآن نے استعمال حرام کی اجازت دی ہے وہ ایسے ہی ہیں جن میں ہلاکت کا خطرہ یقینی ہے، جس صورت میں ہلاکت جان کا خطرہ یقینی نہ ہو اگرچہ خوف کسی درجہ میں ہو، وہ بھی حالت اضطرار نہیں مثلاً ایک شخص کسی قتل کی دھمکی دیتا ہے اور ارادہ بھی کر لیتا ہے مگر صرف اتنی بات سے یہ شخص مضطر نہ کہلائے گا جب تک کہ حالات و اسباب قتل ایسے جمع نہ ہو جائیں جن سے بچ کر نکلتا ممکن نہ ہو، مثلاً قاتل کے پاس آلات قتل موجود ہیں، یہ شخص تنہا ہے کسی دوسرے کی امداد کا احتمال نہیں اور خود اپنی طاقت سے اس کا مقابلہ کر کے اپنی جان بچا نہیں سکتا تو یہ شخص شرعاً مضطر کہلائے گا، جس کے لیے کلمہ کفر زبان سے کہہ دینے کی یا کسی حرام چیز

حلال کر لیا جائے تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے۔ (معارف القرآن ۷/۵۲۳)

مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کے لیے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کے ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت میں دے دیا پھر کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دے دیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا تو پھر شوہر نے بیوی کو ہبہ کر دیا اس طرح کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی، ایسا کرنا چونکہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے اس لیے حرام ہے۔ اور شاید اس کا وبال ترک زکوٰۃ کے وبال سے زیادہ بڑا ہو۔ (روح المعانی از مبسوط سرخسی، معارف القرآن ۷/۵۲۳)

حاجت، ضرورت اور منفعت وغیرہ کی تعریف اور ان کا حکم

علامہ حموی نے شرح الاشباہ والنظائر میں بحوالہ فتح القدر نقل کیا ہے کہ یہاں پانچ درجے ہیں، ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول۔

(حموی علی الاشباہ طبع ہند ص: ۱۰۸)

ضرورت: کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا، یہی صورت اضطرار کی ہے اسی حالت میں حرام و ممنوع چیز کا استعمال چند شرائط کے ساتھ جو آگے آرہے ہیں، جائز ہو جاتا ہے۔

حاجت: کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیزوں کو استعمال نہ کریں تو ہلاک تو نہیں ہوگا مگر مشقت و تکلیف شدید ہوگی، یہ صورت اضطرار کی نہیں اس لیے اس کے واسطے روزے، نماز، طہارت کے بہت سے احکام میں رعایت و سہولتیں تو دی گئی ہیں مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی۔

منفعت: منفعت یہ ہے کہ چیز کے استعمال کرنے سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا لیکن نہ کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں جیسے عمدہ قسم کے کھانے

پہلی صورت کا حکم

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانون الہی کی صریح ممانعت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

دوسری صورت کا حکم

دوسری صورت میں اگر الفاظ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو قسم ہو جائے گا۔

قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں، ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے کہ اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا یا فلاں کام نہ کروں گا یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں اس کا حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارۃً قسم ادا کرے۔

تیسری قسم کا حکم

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن و سنت میں منصوص ہے اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیت ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں انہوں نے اپنے نفس

کے استعمال کی اجازت قرآن کریم نے دی ہے۔ (جواہر الفقہ ۲/۲)

مضطر شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرہ میں ہو معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جاسکتا، جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچے گا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی رہے گی اس لیے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیز کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لیے کافی ہو پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

(معارف القرآن ۴۲۰/۱)

خلاصہ یہ ہے کہ کسی حرام چیز کا حلال ہونا تین شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔
اول یہ کہ حالت اضطرار کی ہو کہ حرام کے استعمال نہ کرنے میں جان کا خطرہ ہے۔
دوسرے یہ کہ خطرہ بھی محض موہوم نہ ہو بلکہ کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کے کہنے کی بنا پر عادتہً یقینی جیسا ہو۔

تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال سے جان بچ جانا بھی عادتہً یقینی ہو یہ سب شرائط قرآن کریم ہی کے ارشادات سے مستفاد ہیں۔ (جواہر الفقہ ۳۰۶/۱)

حلال کو حرام کر لینے کی تین صورتیں اور ان کا حکم

”لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتٍ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ“ (پ ۷، سورۃ المائدہ)

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لیے حرام کرے، مثلاً قسم کھائے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا، یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا یا فلاں جائز کام نہ کروں گا۔ تیسرا یہ کہ اعتقاد و قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لیے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے۔

کے لیے ان چیزوں کو مضمر سمجھا یا کسی بزرگ نے مضمر بتلایا اس لیے بطور علاج چھوڑ دیا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (معارف القرآن ۱۲۲۰/۳، ماندہ)

کفار فروع کے مکلف ہیں یا نہیں

دوسرا اشکال یہ ہے کہ کفار بہت سے فقہاء کے نزدیک مخاطب بالفروع نہیں ہوتے یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ کے احکام ان پر عائد نہیں ہوتے ان پر عائد حکم تو یہ ہے کہ وہ پہلے ایمان قبول کریں ایمان کے بعد یہ فرائض عائد ہوتے ہیں، تو جب ان پر زکوٰۃ کا فرض عائد ہی نہیں اس کے ترک پر عتاب کیسا۔

جواب یہ ہے کہ بہت سے ائمہ و فقہاء کے نزدیک تو کفار بھی مخاطب بالفروع ہیں، ان کے اعتبار سے تو یہ اشکال ہی نہیں ہوتا اور جو لوگ کفار کو مخاطب بالفروع نہیں مانتے وہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ترک زکوٰۃ پر اصل مذمت نہیں بلکہ ان کا ترک زکوٰۃ چونکہ کفر کی بنیاد پر تھا اور ترک زکوٰۃ اس کی علامت تھی اس لیے ان کو عتاب کرنے کا حاصل یہ ہوا کہ تم مومن ہوتے تو زکوٰۃ کی پابندی کرتے تمہارا قصور ایمان نہ لانا ہے۔

(معارف القرآن: ۶۱۳/۷، پ: ۲۴، سورۃ حم السجدہ)

کفر و اسلام، ایمان و نفاق
توحید و شرک، سنت و بدعت

باب ۹

دین و شریعت اور مذہب کا فرق

عربی زبان میں لفظ دین کے چند معنی ہیں جس میں ایک معنی ہیں طریقہ اور روش، قرآن کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء میں مشترک ہیں، اور لفظ ”شریعت“ یا ”منہاج“ یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ ”مذہب“ فروعی احکام کے لیے بولے جاتے ہیں جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا۔ (سورہ زُحُف)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین جاری فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام کو اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار، روز قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزاء و سزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لائے ہوئے احکام پر اسی طرح ایمان لانا۔

اور لفظ ”اسلام“ کے اصلی معنی ہیں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا اور اس کے تابع فرمان ہونا، اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی و رسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے، اور ان کا دین دین اسلام تھا، اسی معنی کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: وَأَمَرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (سورہ یونس: ۷۲)۔

اور اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اور اپنی امت کو امت مسلمہ فرمایا: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریں نے اسی معنی کے اعتبار سے کہا تھا: ”وَأَشْهَدُ بَأَنَّا مُسْلِمُونَ“ (آل عمران: ۵۲)

اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین و شریعت کے لیے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کر دیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا، اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی اور امت محمدیہ کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے، جبریل علیہ السلام کی ایک حدیث جو تمام کتب حدیث میں مشہور ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی یہی خاص تفسیر بیان فرمائی ہے، آیت مذکورہ کے لفظ ”الاسلام“ میں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، پہلے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین صرف دین اسلام ہے یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنانا اور ہر زمانہ میں جو رسول آئے اور وہ جو کچھ احکام لائے اس پر ایمان لانا اور اس کی تعمیل کرنا اس میں دین محمدی کی اگرچہ تخصیص نہیں لیکن عام قاعدہ کے ماتحت حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان پر اور ان کے لائے ہوئے تمام احکام پر ایمان و عمل بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں دین مقبول وہ تھا جو نوح

بعد صرف دین اسلام کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے اس کے سوا کوئی دین مقبول اور ذریعہ نجات نہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مختلف عنوانات سے آیا ہے۔ ایک آیت کے الفاظ میں اس طرح وارد ہے: ”وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ“ (یعنی جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے) اس کے تابع جو عمل کیا جائے گا وہ ضائع ہوگا۔

(معارف القرآن ۱۲/۳، سورہ آل عمران)

نجات منحصر ہے اسلام میں غیر مسلم کے اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ بھی مقبول نہیں

ان آیات نے پوری وضاحت کے ساتھ اس لمحہ نظر یہ کا خاتمہ کر دیا جس میں اسلام کی رواداری کے نام پر کفر و اسلام کو ایک کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ دنیا کا ہر مذہب خواہ یہودیت و نصرانیت ہو یا بت پرستی ہر ایک ذریعہ نجات بن سکتا ہے، بشرطیکہ اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کا پابند ہو، اور یہ درحقیقت اسلام کے اصول کو منہدم کرنا ہے، جس کا حاصل یہ ہو جاتا ہے کہ اسلام کی کوئی حقیقت ہی نہیں محض ایک خیالی چیز ہے، جو کفر کے ہر جامہ میں بھی کھپ سکتا ہے، قرآن کریم کی ان آیات اور انہیں جیسی بے شمار آیات نے کھول کر بتلادیا ہے کہ جس طرح اجالا اور اندھیرا ایک نہیں ہو سکتے یہ بات نہایت نامعقول اور ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی نافرمانی اور بغاوت بھی ایسے ہی پسند ہو جیسے اطاعت و فرمانبرداری، جو شخص اصول اسلام میں سے کسی ایک چیز کا منکر ہے وہ بلاشبہ خدا تعالیٰ کا باغی اور اس کے رسولوں کا دشمن ہے خواہ فروعی اعمال اور رسمی اخلاق میں وہ کتنا ہی اچھا نظر آئے نجات آخرت کا مدار سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اس

علیہ السلام لائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں وہ جو ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ تھا جو الواح تورات اور موسوی تعلیمات کی صورت میں آیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ جو انجیل اور عیسوی ارشادات کے رنگ میں نازل ہوا، اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا اسلام وہ ہوگا جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے نقشہ پر مرتب ہوا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نبی کے زمانہ میں ان کا لایا ہوا دین ہی دین اسلام اور عند اللہ مقبول تھا، جو بعد میں یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتا چلا آیا، آخر میں خاتم الانبیاء کا دین دین اسلام کہلایا جو قیامت تک باقی رہے گا۔ اور اگر اسلام کے دوسرے معنی لیے جائیں یعنی وہ شریعت جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تو آیت کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی اسلام مقبول ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہے، پچھلے ادیان کو بھی اگرچہ ان کے اوقات میں اسلام کہا جاتا تھا، مگر اب وہ منسوخ ہو چکے ہیں، اور دونوں صورتوں میں نتیجہ کلام ایک ہی ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں اللہ کے نزدیک مقبول دین وہ اسلام ہے جو اس پیغمبر کی وحی اور تعلیمات کے مطابق ہو، اس کے سوا دوسرا کوئی دین مقبول نہیں، خواہ وہ پچھلی منسوخ شدہ شریعت ہی ہو، اگلے زمانہ کے لیے وہ اسلام کہلانے کی مستحق نہیں، شریعت ابراہیم علیہ السلام ان کے زمانہ میں اسلام تھی، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس شریعت کے جو احکام منسوخ ہو گئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعت موسویہ کا اگر کوئی حکم منسوخ ہوا ہے تو وہ اب اسلام نہیں، ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرائع سابقہ کے جو احکام منسوخ ہو گئے، وہ اب اسلام نہیں رہے اس لیے جو امت قرآن کی مخاطب ہے اس کے لیے اسلام کے معنی عام لیے جائیں یا خاص دونوں کا حاصل یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے

کے رسول کی فرماں برداری پر ہے جو اس سے محروم رہا اس کے کسی عمل کا اعتبار نہیں، قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے اعمال کے متعلق ارشاد ہے:

”فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا“

یعنی ہم قیامت کے دن ان کے کسی عمل کا وزن قائم نہ کریں گے۔

(معارف القرآن: ۱۲/۱، آل عمران پ: ۳)

اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب میں نجات نہیں ہو سکتی

قرآن حکیم کے اس واضح فیصلہ نے ان لوگوں کی بے راہی اور کج روی کو پوری طرح کھول دیا ہے، جو دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ رواداری میں مذہب اور مذہبی عقائد کو بطور نوتہ اور ہبہ کے پیش کرنا چاہتے ہیں اور قرآن و سنت کے کھلے ہوئے فیصلوں کے خلاف دوسرے مذہب والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں، یہودی اپنے مذہب پر اور عیسائی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی نجات پاسکتا ہے حالانکہ یہ لوگ سب رسولوں کے یا کم از کم بعض رسولوں کے منکر ہیں، جن کے کافر جہنمی ہونے کا اس آیت نے اعلان کر دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی اور احسان و رواداری کے معاملہ میں اپنی مثال نہیں رکھتا لیکن احسان و سلوک اپنے حقوق اور اپنی ملکیت میں ہوا کرتے ہیں، مذہبی اصول و عقائد ہماری ملکیت نہیں جو ہم کسی کو تحفہ میں پیش کر سکیں، اسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے، اسی طرح وہ اپنی سرحدات کی حفاظت میں نہایت محتاط اور سخت بھی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی اور انتہائی رواداری کے ساتھ کفر اور رسوم کفر سے پوری طرح اعلان برأت بھی کرتا ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ ایک قوم بھی قرار دیتا ہے اور ان کے قومی شعائر کی پوری طرح

حفاظت بھی کرتا ہے، وہ عبادت کی طرح مسلمانوں کی معاشرت کو بھی دوسروں سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے جس کی بے شمار مثالیں قرآن و سنت میں موجود ہیں۔

اگر اسلام اور قرآن کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہر مذہب و ملت میں نجات ہو سکتی ہے تو اس کو مذہب اسلام کی تبلیغ پر اتنا زور دینے کا کوئی حق نہ تھا اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا اصولاً غلط اور خلاف عقل ہوتا، بلکہ اس صورت میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول معاذ اللہ بے کار اور فضول ہو جاتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا سارا جہاد بے معنی بلکہ ملک گیری کی ہوس رہ جاتی ہے۔

ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو

غلط فہمی کا ازالہ اور ایک شبہ کا جواب

اس معاملہ میں بعض لوگوں کو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ سے شبہ ہوا ہے، جس میں ارشاد ہے:

”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“

یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت میں چونکہ ایمانیات کی پوری تفصیل دینے کے بجائے صرف ایمان باللہ والیوم الآخر پر اکتفاء کیا گیا ہے تو جو لوگ قرآن کو صرف ادھورے مطالعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھنا نجات کے لیے کافی

ایمان بالرسالہ کے بغیر نجات نہیں

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ“۔ (سورہ مائدہ: پ ۶، آیت: ۶۹)

ظاہر ہے کہ اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں نہ اس کا کوئی موقع ہے۔ اسلام کے چند بنیادی عقائد ذکر کر کے تمام اسلامی عقائد کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا مقصود ہے اور نہ یہ کوئی ضروری بات ہے کہ ہر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر آئے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں اس لیے اس جگہ ایمان بالرسول یا ایمان بالعبودۃ کا ذکر صراحۃً نہ ہونے سے کسی ادنیٰ فہم و عقل اور انصاف و دانش رکھنے والے کو کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی، خصوصاً جب کہ پورا قرآن اور اس کی سیکٹروں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات سے لبریز ہیں، جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول اور ارشادات رسول پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں، اور کوئی ایمان و عمل بغیر اس کے مقبول و معتبر نہیں، لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مکروہ نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے اور انہوں نے اس آیت میں صراحۃً ذکر رسالت نہ ہونے سے ایک نیا نظریہ قائم کر لیا جو قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے قطعاً خلاف ہے، وہ یہ کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب یہودی، نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجات آخرت کا مستحق ہو سکتا ہے، نجات اخروی کے لیے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں۔ (نعوذ باللہ منہ)

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے، ان کے لیے قرآنی تصریحات سے اس مغالطہ کا دور کر دینا کسی بڑے علم و نظر کا محتاج نہیں، قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو بآسانی سمجھ

ہے رسولوں پر ایمان شرط نجات نہیں اور یہ نہ سمجھ سکے کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، ورنہ محض خدا کے اقرار اور توحید کا تو شیطان بھی قائل ہے، قرآن کریم نے خود اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے۔

”فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ“۔ (سورہ بقرہ: پ ۱)

یعنی ان کا ایمان اس وقت معتبر ہوگا جب کہ وہ عام مسلمانوں کی طرح ایمان اختیار کریں جس میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول لازم ہے، ورنہ پھر سمجھ لو کہ وہی لوگ تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان کے لیے کافی ہے اور وہ بہت سننے والا جاننے والا ہے۔

اور پیش نظر آیات میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بتلادیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی ایک رسول کا بھی منکر ہو وہ کھلا کافر ہے۔ اور اس کے لیے عذاب جہنم ہے، ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، اس کے بغیر اس کو ایمان باللہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

آخری آیت میں پھر ایجابی طور پر بیان فرمادیا گیا ہے کہ نجات آخرت انہی لوگوں کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے سب رسولوں پر بھی ایمان رکھیں اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

إِنَّ الْقُرْآنَ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔

یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر و تشریح کرتا ہے۔

خود قرآنی تفسیر کے خلاف کوئی تفسیر کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔

(معارف ۵۹۶/۲، سورہ نساء پ ۶)

یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

تو اب کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں تو بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، اور بغیر مسلمان ہوئے، وہ جنت اور فلاح آخرت پاسکتے ہیں۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہر مذہب و ملت ایسی چیز ہے کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کر لینا نجات اور فلاح کے لیے کافی ہے، تو پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن ہی بے معنی ہو جاتا ہے، اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجنا فضول ہو جاتا ہے، سب سے پہلا رسول ایک شریعت ایک کتاب لے آتا، وہ کافی تھی دوسرے رسولوں کتابوں شریعتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس شریعت و کتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کراتے جو عام طور پر ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے، اور اس صورت میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ ”لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شَرْعَةً وَمِنْهَاجًا“، یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے ایک خاص شریعت اور خاص راستہ بنایا ہے، یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود و نصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا، بلکہ قتل و قتل اور سیف و سنان کی جنگیں بھی لڑی اور اگر انسان کے مومن اور مقبول عند اللہ ہونے کے لیے صرف اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو بیچارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہوتا کیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا؟ یا وہ روزِ آخرت اور قیامت کا منکر تھا؟ اس نے تو عین حالت غضب میں بھی ”إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ“ کہہ کر ایمان بالآخرت کا اقرار کیا ہے۔

سکتے ہیں، چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں:

قرآن کریم نے جس جگہ ایمان مفصل کا بیان فرمایا اس کے الفاظ سورہ بقرہ کے آخر میں یہ ہیں:

”كُلُّ أَمَنٍ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقِرُّ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ“۔ (سورہ بقرہ پ: ۳)

سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔

اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں، ان میں یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لیے کافی نہیں بلکہ تمام رسولوں پر ایمان شرط ہے، اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر اور مقبول نہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

”إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا، أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا“۔ (سورہ نساء پ: ۶)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں، کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ ہو اور وہ یہ چاہیں کہ کفر و اسلام کے بیچ بیچ کا ایک راستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی اصل میں کافر ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لو كان موسى حيا لما وسعه الا اتباعي۔ (مشکوٰۃ شریف)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مغالطہ صرف اس نظریہ کی پیداوار ہے کہ مذہب کو برادری کے نوتہ کی طرح کسی کو تحفہ میں دیا جاسکتا ہے اور اسکے ذریعہ دوسری قوموں سے رشتے جوڑے جاسکتے ہیں حالانکہ قرآن کریم نے کھول کھول کر واضح کر دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری، ہمدردی، احسان و سلوک اور مروت سب کچھ کرنا چاہئے، لیکن مذہب کی حدود کی پوری حفاظت اور اس کی سرحدوں کی پوری نگرانی کے ساتھ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اگر بالفرض ایمان بالرسول کا ذکر بالکل نہ ہوتا تو دوسری آیات قرآن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے جن میں اس کی اشد تاکید موجود ہے وہ کافی تھیں لیکن اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت میں بھی ایمان بالرسول کی طرف واضح اشارہ ہے، کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو، قرآن کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا: ”فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنُتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا“، یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا مستحق ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول تھا، اس لیے من آمن باللہ کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔

(معارف القرآن ۲/۲۳۷، مائدہ پ: ۶)

ایمان کی تعریف

ایمان کی تعریف کو قرآن نے يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لیے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آ جاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے

اسی لیے محسوسات و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے اور اصطلاح شرع میں خبر رسول کو ایمان بالغیب کی حقیقت اور ایمان مجمل و مفصل بغیر مشاہدہ کے محض رسول کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں نہ کان سے سنائی دیں نہ ناک سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر ان کا علم ہو سکے، اور نہ ہاتھ سے چھو کر ان کو معلوم کیا جاسکے۔

قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور ان کا علم بجاہت عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آ جاتی ہیں، تقدیر امور، جنت دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقین بھی، جس کی تفصیل اسی سورہ بقرہ کے ختم پر آمن الرسول میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمان مفصل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنی یہ ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات و تعلیمات لے کر آئے ہیں ان سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ (عقیدہ طحاوی، عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان

تک پہنچتا ہے، مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں۔

شریعت میں یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلم تو ہو مؤمن نہ ہو، یا مؤمن ہو مسلم نہ ہو، مگر یہ کلام اصطلاحی ایمان و اسلام میں ہے، لغوی معنی کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو، مؤمن نہ ہو، جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا کہ ظاہری اطاعت احکام کی بنا پر مسلم کہلاتے تھے، مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مؤمن نہ تھے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن ۸/۱۲۹، حجرات پ ۲۶)

ایمان اور اسلام میں فرق

لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کا، ایمان کا محل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء و جوارح، لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محض دل میں تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن وحدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔

اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا مگر اس کو ماننا نہیں اس لیے وہ مؤمن نہیں۔ (معارف القرآن ۹۹/۱، بقرہ پ ۱)

اسلام اور ایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟

وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا۔ (پ ۲۶، حجرات)

اسلام کے لفظی معنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنے کے ہیں، اور یہ (بدوی) لوگ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرنے کے لیے کچھ اعمال مسلمانوں جیسے کرنے لگے تھے، اس لیے لفظی اعتبار سے ایک درجہ کی اطاعت ہو گئی، اس لیے لغوی معنی کے اعتبار سے اسلمنا کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔

(اس) تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں اسلام کے لغوی معنی مراد ہیں، اصطلاحی معنی مراد ہی نہیں، اس لیے اس آیت سے اسلام اور ایمان میں اصطلاحی فرق پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، اور اصطلاحی ایمان اور اصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اصطلاح شرع میں تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اسلام نام ہے اعمال ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کا لیکن شریعت میں تصدیق قلبی اس وقت تک قابل اعتبار نہیں جب تک اس کا اثر جوارح کے اعمال و افعال تک نہ پہنچ جائے، جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمہ اسلام کا اقرار کرے۔

اسی طرح اسلام اگرچہ اعمال ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اس وقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے، ورنہ وہ نفاق ہے، اس طرح اسلام و ایمان مبدأ اور منتہا کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہو کر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے، اور اسلام افعال ظاہرہ سے شروع ہو کر باطن کی تصدیق

کفر و نفاق کی تعریف

جب اسلام یعنی ظاہری اقرار و فرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے:

”إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ“۔ (سورہ نساء: ۵)

یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے۔

اسی طرح ایمان یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے ارشاد ہے ”يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ“ یعنی یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے ہی یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

”جَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا“۔ (پ: ۱۹، نمل آیت نمبر: ۱۳)

یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں میں ان کا یقین کامل ہے اور ان کی یہ حرکت محض ظلم و تکبر کی وجہ سے ہے۔

میرے استاذ محترم حضرت العلام سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے فرق صرف ابتداء و انتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی ظاہر اقرار و اطاعت تک نہ پہنچے وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں۔

امام غزالی اور امام سبکی کی بھی یہی تحقیق ہے اور امام ابن ہمام نے مسامرہ میں اسی تحقیق پر تمام اہل حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔ (معارف القرآن ص: ۱۰۲، سورہ بقرہ پ: ۱)

کفر و نفاق عہد نبوی کے ساتھ خاص تھا یا اب بھی

موجود ہے؟

اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہنچانا اور اس کو منافق قرار دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلادیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اس کے کسی قول و فعل سے کسی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

ملحد و زندیق کی تعریف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب ان کے پہنچانے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قطعی عقائد کی مخالفت یا ان پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام قرآن کی اصطلاح میں ملحد ہے ”إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا“ اور حدیث میں اس کو زندیق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر دلیل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لیے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے۔ اسی لیے علماء امت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مؤمن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالکؒ سے ”عمدہ“ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہنچانا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔ (معارف القرآن ۱۲/۱ سورہ بقرہ)

معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے، ان سے آخرت میں کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معمولی ہوگا۔ اس لیے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے ان کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور جھوٹ ہوا۔ (معارف القرآن، ۱۲/۱)

ایمان کے صحیح اور معتبر ہونے کا معیار

قادیانی مسلمان کیوں نہیں؟

قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر اوپر سورہ بقرہ کی تیرہویں آیت میں آچکا ہے ”وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا كَمَا امْنَتِ النَّاسُ“ جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص قرآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں جیسا کہ آج کل قادیانی گروہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدہ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرام کے ایمان سے بالکل مختلف تحریف کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کے لیے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مہم بمؤمنین کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے

ایمان و کفر کی حقیقت، یہودی مؤمن کیوں نہیں؟

آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف ایمان کا دعویٰ آمَنَّا بِاللَّهِ میں، اور قرآن کریم کی طرف سے ان کے اس دعوے کا غلط ہونا وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔

اول یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلم ہے، اور جو چیز ان کے عقیدہ میں نہیں تھی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں ان کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں ان کو جھوٹا قرار دینا اور ان کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے؟

بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب سے بڑا قادر مطلق مانتے ہیں اور مشرکین ہندوستان تو پر لو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں بلکہ صرف وہ ایمان معتبر ہے جو اس کی بتلائی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہوا اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و اوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور آخرت کے

نماز روزہ میں شریک بھی ہو، مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا اس وقت تک وہ قرآن کی اصطلاح میں مومن نہیں کہلائے گا۔
(معارف القرآن، ۱۲۸/۱)

اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جائے گا، اس کا مطلب

حدیث و فقہ کا مشہور مقولہ کہ ”اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا، اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متعین ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے مگر یہ صرف رو قبلہ نماز پڑھنا ان کے ایمان کے لیے اس بناء پر کافی نہ ہوا کہ ان کا ایمان صحابہ کرام کی طرح تمام ضروریات دین پر نہیں تھا۔

(معارف القرآن ۱۲۸/۱، سورہ بقرہ)

الحاد و زندقہ کی تعریف اور اس کا حکم

”إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا“ - (سورہ حم السجدہ)

اس سے پہلی آیات میں ان منکرین توحید و رسالت کو زجر و تنبیہ اور ان کے عذاب کا ذکر تھا جو رسالت و توحید کا کھل کر صاف انکار کرتے تھے، یہاں سے انکار کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا نام الحاد ہے۔ لحد اور الحاد کے لغوی معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں، قبر کی لحد کو بھی اسی لیے لحد کہتے ہیں، کہ وہ ایک طرف مائل ہوتی ہے۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں آیات قرآنی سے عدول و انحراف کو الحاد کہتے ہیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو یہ عام ہے صراحۃً کھلے طور پر انکار و انحراف کرے یا تاویلات فاسدہ کے بہانہ سے انحراف کرے۔ لیکن عام طور سے الحاد ایسے انحراف کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں تو قرآن اور اس کی آیات پر ایمان و تصدیق کا دعویٰ کرے مگر ان کے

معانی اپنی طرف سے ایسے گھڑے جو قرآن و سنت کی نصوص اور جمہور امت کے خلاف ہوں اور جس سے قرآن کا مقصد ہی الٹ جائے۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں الحاد کے معنی یہی منقول ہیں فرمایا: الا لحاد هو وضع الكلام على غير موضعه۔ اور آیت مذکورہ میں ارشاد: لَا يَخْفُونَ عَلَيْنَا بھی اس کا قرینہ ہے کہ الحاد کوئی ایسا کفر ہے جس کو یہ لوگ چھپانا چاہتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہم سے اپنا کفر نہیں چھپا سکتے۔

اور آیت مذکورہ نے صراحۃً یہ بتلادیا کہ آیات قرآنی سے انکار و انحراف صاف اور کھلے لفظوں میں ہو یا معانی میں تاویلات باطلہ کر کے قرآن کے احکام کو بدلنے کی فکر کرے یہ سب کفر و ضلال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الحاد ایک قسم کا کفر نفاق ہے کہ ظاہر میں قرآن اور آیات قرآن کو ماننے کا دعویٰ اور اقرار کرے، لیکن آیات قرآنی کے معانی ایسے گھڑے جو دوسری نصوص قرآن و سنت اور اصول اسلام کے منافی ہوں۔ امام یوسفؒ نے کتاب الخراج میں فرمایا:

كذلك الزنادقة الذين يلحدون وقد كانوا يظهرون الاسلام۔
ایسے ہی وہ زندیق لوگ ہیں جو الحاد کرتے ہیں اور بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔
اس سے معلوم ہوا کہ لحد اور زندیق دونوں ہم معنی ہیں جو ایسے کافر کو کہا جاتا ہے جو ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرے، اور حقیقت میں اس کے احکام کی تعمیل سے انحراف کا یہ بہانہ بنائے کہ قرآن کے معانی ہی ایسے گھڑے جو خلاف نصوص و خلاف اجماع امت ہوں۔

(معارف القرآن، ۶۵۹/۷، سورہ حم السجدہ)

تاویل کرنے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا، اس کی تشریح

کتب عقائد میں ایک ضابطہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ متاویل کو کافر نہیں کہنا چاہئے

ایمان کی تعریف

ایمان کی تعریف جمہور امت کے نزدیک یہی ہے کہ:

تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما علم مجیئہ بہ ضرورۃً۔
یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا ان تمام امور میں جن کا بیان کرنا اور
حکم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرورۃً ثابت ہو یعنی ایسا یقین ثابت ہو کہ علماء
کے سوا عوام بھی اس کو جانتے ہوں۔

کفر کی تعریف

اس لیے کفر کی تعریف اس کے بالمقابل یہ ہوگی کہ جن چیزوں کا لا نا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے ضروری اور قطعی طور پر ثابت ہو ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔
تو جو شخص ایسی ضروریات دین میں تاویل کر کے اس حکم کو بدلے وہ آپ کی لائی
ہوئی تعلیم کا انکار کرتا ہے۔

اس زمانہ میں کفر والحاد کی گرم بازاری

اس زمانے میں ایک طرف تو دین اور احکام دین سے جہالت اور غفلت انتہا کو
پہنچ گئی کہ نئے لکھے پڑھے لوگ بہت سی ضروریات دین سے بھی ناواقف رہتے ہیں،
دوسری طرف جدید بے خدا تعلیم جس کی بنیاد ہی مادہ پرستی پر ہے، کچھ اس کے اثر سے اس
پر مزید یورپ کے مستشرقین کے پھیلائے ہوئے اسلام کے خلاف شبہات و اوہام سے
متاثر ہو کر بہت سے ایسے لوگوں نے اسلام اور اصول اسلام پر بحث و گفتگو شروع کر دی
ہے جن کو اسلام کے اصول و فروع، قرآن و حدیث کے علوم سے کوئی واسطہ نہیں، انہوں
نے اسلام کے متعلق اگر کچھ معلومات بھی حاصل کی ہیں، تو اہل یورپ دشمنان اسلام

یعنی جو شخص عقائد باطلہ اور کلمات کفریہ کو کسی تاویل سے اختیار کرے وہ کافر نہیں، لیکن
اس ضابطہ کا مفہوم اگر عام لیا جائے کہ کیسے ہی قطعی اور یقینی حکم میں تاویل کرے اور کیسی
ہی فاسد تاویل کرے وہ بہر حال کافر نہیں تو اس کا نتیجہ یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں
مشرکین، بت پرست یہود و نصاریٰ میں سے کسی کو بھی کافر نہ کہا جائے کیونکہ بت پرست
مشرکین کی تاویل تو قرآن میں مذکور ہے ”مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ
زُلْفَىٰ“، یعنی ہم بتوں کی فی نفسہ عبادت نہیں بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں سفارش
کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں، تو درحقیقت عبادت اللہ کی ہے، مگر قرآن نے ان کی
اس تاویل کے باوجود انہیں کافر کہا، یہود و نصاریٰ کی تاویلیں تو بہت ہی مشہور و معروف
ہیں، جن کے باوجود قرآن و سنت کی نصوص میں ان کو کافر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا
کہ متاویل کو کافر نہ کہنے کا مفہوم عام نہیں۔

اسی لیے علماء و فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ تاویل جو تکفیر سے مانع ہوتی ہے
اس کی شرط یہ ہے کہ وہ ضروریات دین میں ان کے مفہوم قطعی کے خلاف نہ ہو۔

(معارف القرآن، ۶/۵۹۷)

ضروریات دین کی تعریف

ضروریات دین سے مراد وہ احکام و مسائل ہیں جو اسلام اور مسلمانوں میں اتنے
متواتر اور مشہور ہوں کہ مسلمانوں کے ان پڑھ جاہلوں تک کو بھی ان سے واقفیت ہو، جیسے
پانچ نمازوں کا فرض ہونا، صبح کی دو، ظہر کی چار رکعت کا فرض ہونا۔ رمضان کے روزے فرض
ہونا، سود، شراب، خنزیر کا حرام ہونا وغیرہ اگر کوئی شخص ان مسائل سے متعلق آیات قرآن
میں ایسی تاویل کرے جس سے مسلمانوں کا متواتر اور مشہور مفہوم الٹ جائے وہ بلاشبہ با
جماع امت کافر ہے، کیونکہ وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے انکار ہے۔

امت کا میدان اجتہاد ہے جو بتقریح حدیث ہر حال میں باعث اجر و ثواب ہے۔

(معارف القرآن ص: ۶۶۱ ج ۷، سورۃ السجدہ)

کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّكُمْ اِذَا مَثَلْتُمْ یعنی اگر تم ایسی مجلس میں بطیب خاطر شریک رہے جس میں آیات الہیہ کا انکار یا استہزاء یا تحریف ہو رہی ہو تو تم بھی ان کے گناہ کے شریک ہو کر انہی جیسے ہو گئے، مراد یہ ہے کہ خدا نخواستہ تمہارے جذبات خیالات بھی ایسے ہیں کہ تم ان کے کفریات کو پسند کرتے اور اس پر راضی ہوتے ہو تو حقیقتہً تم بھی کافر ہو، کیونکہ کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہے، اور اگر یہ بات نہیں تو ان کی مثل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور دین کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں تم اپنی اس شرکت کے ذریعہ ان کی امداد کر کے معاذ اللہ ان کی مثل ہو گئے۔ (معارف القرآن ۲/۵۸۷، سورۃ نساء ۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا بھی کفر ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ الآیہ
اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علوم مرتبت کے اظہار کے ساتھ آپ کی اطاعت جو بے شمار آیات قرآنیہ سے ثابت ہے اس کی واضح تشریح بیان فرمائی ہے، اس آیت میں قسم کھا کر حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈے دل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے کہ اس کے دل میں بھی اس فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائی جائے۔

سے حاصل کی ہیں۔ ایسے لوگوں نے قرآن و حدیث کی نصوص قطعیہ ضروریہ میں طرح طرح کی باطل تاویلیں کر کے شریعت اسلام کے متفق علیہ اور نصوص قطعیہ سے ثابت شدہ احکام کی تحریف کو اسلام کی خدمت سمجھ لیا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ کھلا کفر ہے تو وہ مشہور ضابطہ کا سہارا لیتے ہیں کہ ہم اس حکم کے منکر تو نہیں بلکہ ایک تاویل کر رہے ہیں اس لیے ہم پر یہ کفر عائد نہیں ہوتا۔

اسی لیے وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر ہمارے استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا (محمد انور شاہ) کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام ہے ’اکفار الملحدين والمتأولين في شيء من ضروريات الدين‘ اس میں ہر فرقہ ہر مسلک کے علماء و فقہاء کی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ ضروریات دین میں کسی کی تاویل مسموع نہیں، اور یہ تاویل ان کی تکفیر سے مانع نہیں۔ یہ کتاب بزبان عربی شائع ہوئی ہے، احقر نے اس کا خلاصہ اردو زبان میں بنام ”کفر و اسلام قرآن کی روشنی میں“ شائع کر دیا ہے، اور احکام القرآن حزب خامس میں اس کا خلاصہ بزبان عربی بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھا جاسکتا ہے یہاں اس کا خلاصہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی ایک تحریر سے نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

باطل تاویل کی دو قسمیں اور صحیح تاویل کا مصداق

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ آیات قرآن میں تاویل باطل جس کو قرآن کی آیت مذکورہ میں الحاد فرمایا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، اول وہ تاویل باطل جو نصوص قطعیہ متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو وہ تو بلاشبہ کفر ہے۔ دوسری یہ کہ وہ ایسی نصوص کے خلاف ہو جو اگرچہ ظنی ہیں، مگر قریب بہ یقین ہیں، یا اجماع عرفی کے خلاف ہو ایسی تاویل گمراہی اور فسق ہے۔ کفر نہیں، ان دو قسم کی تاویلوں کے علاوہ باقی تاویلات جو قرآن و حدیث کے الفاظ میں مختلف احتمالات ہونے کی بنا پر ہوں وہ تاویل عام فقہاء

حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اظہار ناراضی فرمایا ہے پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو حقیقت کھل گئی کہ اس آیت کی رو سے وہ شخص مومن ہی نہیں تھا۔

(معارف القرآن ۲/۴۶۱، سورہ نساء پ: ۵)

مسلمان سمجھنے کے لیے علامات اسلام کافی ہیں باطن کی تفتیش کرنا جائز نہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ
أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ
مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا. (سورہ نساء پ: ۵)

مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ بغیر تحقیق کے اس کے قول کو نفاق پر محمول کرے، اس آیت کے نزول کا سبب کچھ ایسے واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کرام سے اس بارہ میں لغزش ہو گئی تھی۔

چنانچہ ترمذی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک آدمی صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ملا جب کہ یہ حضرات جہاد کے لیے جارہے تھے یہ آدمی اپنی بکریاں چرا رہا تھا، اس نے حضرات صحابہ کو سلام کیا، جو عملاً اس چیز کا اظہار تھا کہ میں مسلمان ہوں، صحابہ کرام نے سمجھا کہ اس وقت اس نے محض اپنی جان و مال بچانے کے لیے یہ فریب کیا ہے کہ مسلمانوں کی طرح سلام کر کے ہم سے بچ نکلے، چنانچہ انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کی بکریوں کو مال غنیمت قرار دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص آپ کو اسلامی

اختلافات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنانا آپ

کے عہد مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں

حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ارشاد قرآنی پر عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کے بعد آپ کی شریعت مطہرہ کا فیصلہ خود آپ ہی کا فیصلہ ہے اس لیے یہ حکم قیامت تک اس طرح جاری ہے کہ آپ کے زمانہ مبارک میں خود بلا واسطہ آپ سے رجوع کیا جائے اور آپ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رجوع کیا جائے جو درحقیقت آپ ہی کی طرف رجوع ہے۔

چند اہم مسائل

اول یہ کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنے ہر جھگڑا اور ہر مقدمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مطمئن نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس شخص کو قتل کر ڈالا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا، اور پھر معاملہ کو حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا، اس مقتول کے اولیاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں حضرت عمرؓ پر دعویٰ کر دیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بلا وجہ قتل کر دیا، جب یہ استغاثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوا تو بے ساختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا، مَا كُنْتَ أَظُنُّ أَنَّ عُمَرَ يَجْتَرِي عَلَى قَتْلِ رَجُلٍ مُؤْمِنٍ (یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ عمر کسی مرد مومن کے قتل کی جرأت کریں گے)۔

اس سے ثابت ہوا کہ حاکم اعلیٰ کے پاس اگر کسی ماتحت حاکم کے فیصلہ کی اپیل کی جائے تو اس کو اپنے حاکم ماتحت کی جانب داری کے بجائے انصاف کا فیصلہ کرنا چاہئے، جیسا اس واقعہ میں آیت نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اسلام کی تحقیق کے بغیر قتل کرنا جائز نہیں

اس آیت کے پہلے جملہ میں ایک عام ہدایت ہے کہ مسلمان کوئی کام بے تحقیق محض گمان پر نہ کریں ارشاد ہے ”اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا“ یعنی جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو۔ خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے اس میں سفر کی بھی قید اس وجہ سے ذکر کی گئی کہ یہ واقعات سفر ہی میں پیش آئے، یا اس وجہ سے کہ شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے ورنہ اصل حکم عام ہے، سفر میں ہو یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔“ (بحر محیط)

دوسرے جملہ یعنی ”تَبَيَّنُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا“ اسی روگ کی اصلاح ہے جو اس غلطی پر اقدام کرنے کا باعث ہوا یعنی دنیا کی دولت مال غنیمت حاصل ہونے کا خیال۔

آگے یہ بھی بتلادیا کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت بہت سے مقرر اور مقرر کر رکھے ہیں، تم اموال کی فکر میں نہ پڑو، اس کے بعد ایک اور تنبیہ فرمائی کہ اس پر بھی تو نظر ڈالو کہ پہلے تم میں بھی تو بہت سے حضرات ایسے ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اپنے اسلام و ایمان کا اعلان نہیں کر سکتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ کفار کے زعم سے نجات دے دی، تو اسلام کا اظہار کیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شخص جو لشکر اسلام کو دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا ہے وہ حقیقتہً پہلے سے اسلام کا معتقد ہو مگر کفار کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کرنے پایا تھا، اس وقت اسلامی لشکر کو دیکھ کر اظہار کیا، یا کہ شروع میں جب تم نے کلمہ اسلام کو پڑھ

طرز پر سلام کرے تو بغیر تحقیق کے یہ نہ سمجھو کہ اس نے فریب کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے، اور اس کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر حاصل نہ کرو۔ (ابن کثیر)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک دوسری روایت ہے جس کو بخاری نے مختصراً اور بزار نے مفصلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ مجاہدین کا بھیجا تھا جن میں حضرت مقداد بن اسود بھی تھے، جب وہ موقع پر پہنچے تو سب لوگ بھاگ گئے صرف ایک شخص رہ گیا جس کے پاس بہت مال تھا، اس نے صحابہ کرام کے سامنے ”اشھد ان لا اله الا الله“ کہا مگر حضرت مقدادؓ نے یہ سمجھ کر کہ دل سے نہیں کہا محض جان و مال بچانے کے لیے کلمہ اسلام پڑھ رہا ہے، اس کو قتل کر دیا، حاضرین میں سے ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے برا کیا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا، جس نے لا اله الا الله کی شہادت دی تھی، میں اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو اس واقعہ کا ضرور ذکر کروں گا۔ جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا، آپؐ نے حضرت مقدادؓ کو بلا کر سخت تنبیہ فرمائی، اور فرمایا کہ بروز قیامت تمہارا کیا جواب ہوگا جب کلمہ لا اله الا الله تمہارے مقابلہ میں دعویدار ہوگا؟ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی: ”وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا“۔

مذکورہ آیت کے بارہ میں ان دو واقعات کے علاوہ دوسرے واقعات بھی منقول ہیں لیکن محققین اہل تفسیر نے فرمایا کہ ان روایات میں تعارض نہیں ہو سکتا کہ یہ چند واقعات مجموعی حیثیت سے نزول کا سبب ہوئے ہوں۔

آیت کے الفاظ میں الْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامُ ارشاد ہے، اس میں لفظ ”سلام“ سے اصطلاحی سلام مراد لیا جائے تب تو پہلا واقعہ اس کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے، اور اگر سلام کے لفظی معنی سلامت اور اطاعت کے لیے جائیں تو یہ سب واقعات اس میں برابر ہیں، اسی لیے اکثر حضرات نے ”سلام“ کا ترجمہ اس جگہ اطاعت کا کیا ہے۔

گا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے، اس کی قلبی کیفیات اخلاص یا نفاق سے بحث کرنے کا کسی کو حق نہ ہوگا۔

لیکن جو شخص اظہار اسلام اور اقرار ایمان کے ساتھ ساتھ کلمات کفر بھی کہتا ہے یا کسی بت کو سجدہ کرتا ہے، یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرتا ہے جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے، یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا ہے جیسے گلے میں زنار وغیرہ ڈالنا وغیرہ، وہ بلاشبہ اپنے اعمال کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائے گا۔ آیت مذکورہ میں لفظ ”تَبَيَّنُوا“ سے اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ یہود و نصاریٰ تو سب ہی اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، اور مسیلمہ کذاب جس کو باجماع صحابہ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمہ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعار نماز، اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا، اپنی اذان میں ”أشهد أن لا إله إلا الله“ کے ساتھ ”أشهد أن محمداً رسول الله“ بھی کہلواتا تھا مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی و رسول صاحب وحی کہتا تھا، جو نصوص قرآن و سنت کا کھلا ہوا انکار تھا، اسی کی بنا پر اس کو مرتد قرار دیا گیا، اور اس کے خلاف باجماع صحابہ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ مسئلہ کا یہ ہو گیا کہ ہر کلمہ گواہ اہل قبلہ کو مسلمان سمجھو اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے، اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو، البتہ اظہار ایمان کے ساتھ خلاف ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو، بشرطیکہ اس کا خلاف ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو، اور اس میں کوئی دوسرے احتمال یا تاویل کی راہ نہ ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لفظ ”کلمہ گو“ یا ”اہل قبلہ“ یہ اصطلاحی الفاظ ہیں، جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعی اسلام ہونے کے بعد کسی کافرانہ قول و فعل کا مرتکب نہ ہو۔ (معارف القرآن ۱۷۳۲، سورہ نساء پ ۵)

کراپنے آپ کو مسلمان کہا تو اس وقت تمہیں مسلمان قرار دینے کے لیے شریعت نے یہ قید نہیں لگائی تھی کہ تمہارے دلوں کو ٹٹولیں، اور دل میں اسلام کا ثبوت ملے، تب تمہیں مسلمان قرار دیں، بلکہ صرف کلمہ اسلام پڑھ لینے کو تمہارے مسلمان قرار دینے کے لیے کافی سمجھا گیا تھا، اسی طرح اب جو تمہارے سامنے کلمہ پڑھتا ہے اس کو بھی مسلمان سمجھو۔

اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب

اس آیت کریمہ سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا ہو خواہ کلمہ پڑھ کر یا کسی اور اسلامی شعار کا اظہار کر کے مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں، اس کا انتظار نہ کریں کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے، یا کسی مصلحت سے اسلام کا اظہار کیا ہے۔

نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہوگا، فرض کر لو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لیے امام اعظمؒ نے فرمایا لا نکفر اهل القبلة بذنوب (یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے) بعض روایات حدیث میں بھی اس قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو خواہ وہ کتنا ہی گنہگار بد عمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول و فعل کا صدور نہ ہو جو کفر کی یقینی علامت ہے اس وقت تک اس کے اقرار اسلام کو صحیح قرار دے کر اس کو مسلمان کہا جائے

کسی مسلمان کو کافر یا کافر کو مسلمان کہنے میں افراط و تفریط

کسی مسلمان کو کافر یا کافر کو مسلمان کہنا دونوں جانب سے نہایت ہی سخت معاملہ ہے، قرآن کریم نے دونوں صورتوں پر شدید نکیر فرمائی ہے۔ مسلمان کو کافر کہنے کے متعلق ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمٌ كَثِيرَةٌ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا. (نساء: ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو، اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں کیونکہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں، پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا سو غور کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (یعنی جب تم اول مسلمان ہوئے تھے اگر تمہیں بھی یہی کہہ دیا جاتا کہ تم مسلمان نہیں تو تم کیا کرتے)۔

الغرض اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنا اسلام ظاہر کرے تو جب تک اس کے کفر کی پوری تحقیق نہ ہو جائے اس کو کافر کہنا ناجائز اور وبال عظیم ہے۔ اسی طرح اس کے مقابل یعنی کافر کو مسلمان کہنے کی ممانعت اس آیت میں ہے۔

اتَّبِعُوا مَنَاصِلَ اللَّهِ وَمَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا. (سورہ نساء: آیت نمبر ۸۸)

کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے

گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اُس کے لیے کوئی سبیل نہ پاؤ گے۔

سلف صالح صحابہ و تابعین اور مابعد کے ائمہ مجتہدین نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لینے کی ہدایتیں فرمائی ہیں، حضرات متکلمین اور فقہاء نے اس باب کو نہایت اہم اور دشوار گزار سمجھا ہے، اور اس میں داخل ہونے والوں کے لیے بہت زیادہ تیقظ و بیداری کی تلقین فرمائی ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ قاری نے شرح شفاء فصل (تحقیق القول فی الکفار المتأولین) میں فرمایا ہے:

إدخال كافر في الملة الإسلامية أو إخراج مسلم عنها عظيم في الدين۔ (شرح شفاء ۲/۵۰۰)

کسی کافر کو اسلام میں داخل سمجھنا یا مسلمان کو اسلام سے خارج سمجھنا (دونوں چیزیں) سخت ہیں۔

لیکن آج کل اس کے برعکس یہ دونوں معاملے اس قدر سہل سمجھ لیے گئے ہیں کہ کفر و اسلام اور ایمان و ارتداد کا کوئی معیار اور اصول ہی نہ رہا۔

ایک جماعت ہے جس نے تکفیر بازی کو ہی مشغلہ بنا رکھا ہے ذرا سی خلاف شرع بلکہ خلاف طبع کوئی بات کسی سے سرزد ہوئی اور ان کی طرف سے کفر کا فتویٰ لگا، ادنیٰ ادنیٰ فرعی باتوں پر مسلمانوں کو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں، ادھر ان کے مقابل دوسری جماعت ہے جن کے نزدیک اسلام و ایمان کوئی حقیقت محصلہ نہیں رکھتے بلکہ وہ ہر اس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے خواہ تمام قرآن و حدیث اور احکام اسلامیہ کا انکار اور توہین کرتا رہے ان کے نزدیک اسلام کے مفہوم میں ہر قسم کا کفر کھپ سکتا ہے۔ انہوں نے دوسرے مذاہب باطلہ کی طرح اسلام کو بھی محض ایک قومی

احکام بھی معلوم ہو گئے اور اس مجموعہ کا نام ”وصول الافکار الی اصول الکفار“ رکھا گیا ہے۔
وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ (جواہر الفقہ ۱/۱۲۷)

کفر و اسلام کا معیار

سوال اول

کفر و اسلام کا معیار کیا ہے اور کس وجہ سے کسی مسلمان کو مرتد یا خارج از اسلام کہا جاسکتا ہے؟

الجواب

ارتداد کے معنی لغت میں پھر جانے اور لوٹ جانے کے ہیں، اور اصطلاح شریعت میں ایمان و اسلام سے پھر جانے کو ارتداد اور پھرنے والے کو مرتد کہتے ہیں۔ اور ارتداد کی صورتیں دو ہیں، ایک تو یہ کہ کوئی کم بخت صاف طور پر تبدیل مذہب کر کے اسلام سے پھر جائے جیسے عیسائی، یہودی، آریہ سماجی وغیرہ مذہب اختیار کرے یا خداوند عالم کے وجود یا توحید کا منکر ہو جائے، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دے (العیاذ باللہ تعالیٰ)

دوسرے یہ کہ اس طرح صاف طور پر تبدیل مذہب اور توحید و رسالت سے انکار نہ کرے، لیکن کچھ اعمال یا اقوال یا عقائد ایسے اختیار کرے جو انکار قرآن مجید یا انکار رسالت کے مرادف و ہم معنی ہیں۔ مثلاً اسلام کے کسی ایسے ضروری و قطعی حکم کا انکار کرے۔ یہ رسالہ حضرت مجدد الملت حکیم الامت عارف باللہ سیدی و سندی حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم نے باستیعاب ملاحظہ فرمایا اور بہت سی اصلاحات سے مزین فرمایا اور اس کا نام ”وصول الافکار الی اصول الکفار“ تجویز فرمایا۔

لقب بنادیا ہے کہ عقائد جو چاہے رکھے، اقوال و اعمال میں جس طرح چاہے آزاد رہے۔ وہ بہر حال مسلمان ہے، اور اس کو اپنے نزدیک وسعت خیال اور وسعت حوصلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور تمام سیاسی مصالح کا محور و مدار اسی کو بنا رکھا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کجروی اور افراط و تفریط کے دونوں پہلوؤں سے سخت بیزار ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروں کے لیے ایک آسمانی قانون پیش کیا ہے جو شخص اس کو ٹھنڈے دل سے تسلیم کرے اور کوئی تنگی اپنے دل میں اس کے ماننے سے محسوس نہ کرے، وہ مسلمان ہے، اور جو اس قانون الہی کے کسی ادنیٰ حکم کا انکار کر بیٹھے وہ بلاشبہ و بلا تردد دائرۃ اسلام سے خارج ہے، اس کے دائرۃ اسلام میں داخل رکھنے سے اسلام بیزار ہے، اور اس کے ذریعہ اسلامی برادری کی مردم شماری بڑھانے سے اسلام اور مسلمانوں کو غیرت ہے، اور ان چند لوگوں کے داخل اسلام ماننے سے ہزاروں مسلمانوں کے خارج از اسلام ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے جیسا کہ بہت دفعہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اور یہ ایک مضرت ایسی ہے کہ اگر فی الواقع ہزاروں مصالح بھی اس کے مقابلہ میں موجود ہوں تو وہ کسی مذہب دوست مسلمان کے لیے ہرگز قابل التفات نہیں ہو سکتیں بالخصوص جب کہ وہ مصالح بھی محض موہوم اور خیالی ہوں۔

الغرض بنائے زمانہ کی اس افراط و تفریط اور کفر و اسلام کے معاملہ میں بے احتیاطی کو دیکھ کر مدت سے خیال ہوتا تھا کہ اس بحث پر ایک مختصر جامع رسالہ لکھا جائے جس میں کفر و اسلام کا معیار ہو۔

اور اصولی طور پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ وہ کون سے عقائد یا اقوال و افعال ہیں جن کی بنا پر کوئی مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی اثناء میں ذیل کے سوال کا جواب لکھنے کی ضرورت پیش آئی، تو اسی کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا گیا جس سے علاوہ اصول تکفیر معلوم ہونے کے بعض فرقوں کا حکم بھی واضح ہو گیا۔ اور مرتد کے بعض

بیٹھے، جس کا ثبوت قرآن مجید کی نص صریح سے ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر ثابت ہوا ہو، یہ صورت بھی باجماع امت ارتداد میں داخل ہے اگرچہ اس ایک حکم کے سوا تمام احکام اسلامیہ پر شدت کے ساتھ پابند ہو۔

ارتداد کی اس دوسری صورت میں اکثر مسلمان غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایسے لوگوں کو مسلمان سمجھتے ہیں، اور یہ اگرچہ بظاہر ایک سطحی اور معمولی غلطی ہے لیکن اگر اس کے ہولناک نتائج پر نظر کی جائے تو اسلام اور مسلمان کے لیے اس سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں، کیونکہ اس صورت میں کفر و اسلام کے حدود ممتاز نہیں رہتے کافر و مومن میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ اسلام کے چالاک دشمن اسلامی برادری کے ارکان بن کر مسلمانوں کے لیے ”مار آستین“ بن سکتے ہیں اور دوستی کے لباس میں دشمنی کی ہر قرارداد کو مسلمانوں میں نافذ کر سکتے ہیں۔

اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس صورت ارتداد کی توضیح کسی قدر تفصیل کے ساتھ کردی جائے اور چونکہ ارتداد کی صحیح حقیقت ایمان کے مقابلہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اس لیے پہلے اجمالاً ایمان کی تعریف اور پھر ارتداد کی حقیقت لکھی جاتی ہے۔

ایمان و ارتداد کی تعریف

ایمان کی تعریف مشہور و معروف ہے جس کے اہم جزو دو ہیں، ایک حق سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان لانا، دوسرے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ لیکن جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ پر ایمان کے یہ معنی نہیں کہ صرف اس کے وجود کا قائل ہو جائے بلکہ اُس کی تمام صفات کاملہ علم، سمع، بصر، قدرت وغیرہ کو اُسی شان کے ساتھ ماننا ضروری ہے جو قرآن و حدیث میں بتلائی ہیں، ورنہ یوں تو ہر مذہب و ملت کا آدمی خدا کے وجود و صفات کو مانتا ہے، یہودی، نصرانی، مجوسی، ہندو سب ہی اس پر متفق ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا بھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا

کہ آپ کے وجود کو مان لے کہ آپ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، تریسٹھ سال عمر ہوئی، فلاں فلاں کام کئے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی حقیقت وہ ہے جو قرآن مجید نے بالفاظ ذیل بتلائی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا.

قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تمام نزاعات و اختلافات میں حکم نہ بنادیں اور پھر جو فیصلہ آپ فرماویں، اُس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اس کو پوری طرح تسلیم نہ کر لیں۔

روح المعانی میں اسی آیت کی تفسیر سلف سے اس طرح نقل فرمائی ہے۔

فقد روى عن الصادق رضى الله عنه انه قال لو ان قوما عبدوا الله تعالى واقاموا الصلوة وآتوا الزكوة وصاموا رمضان وحجوا البيت ثم قالوا لشي صنع رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا صنع خلاف ما صنع أو وجدوا في انفسهم حرجاً لكانوا مشركين ثم تلا هذه الآية۔

(روح المعانی ۶۵/۵)

حضرت جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے، اور بیت اللہ کا حج کرے مگر پھر کسی ایسے فعل کو جس کا ذکر حضور سے ثابت ہو یوں کہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اس کے خلاف کیوں نہ کیا، اور اس کے ماننے سے اپنے دل میں تنگی محسوس کرے تو یہ قوم مشرکین میں سے ہے۔

آیت مذکورہ اور اس کی تفسیر سے واضح ہو گیا کہ رسالت پر ایمان لانے کی

حقیقت یہ ہے کہ رسول کے تمام احکام کو ٹھنڈے دل سے تسلیم کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا پس و پیش یا تردد نہ کیا جائے۔

اور جب ایمان کی حقیقت معلوم ہوگئی تو کفر و ارتداد کی صورت بھی واضح ہوگئی کیونکہ جس چیز کے ماننے اور تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے اسی کے نہ ماننے اور انکار کرنے کا نام کفر و ارتداد ہے (صرح بہ فی شرح المقاصد) اور ایمان و کفر کی مذکورہ تعریف سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کفر صرف اسی کا نام نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرے سے نہ مانے، بلکہ یہ بھی اسی درجہ کا کفر اور نہ ماننے کا ایک شعبہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام قطعی و یقینی طور پر ثابت ہیں ان میں سے کسی ایک حکم کے تسلیم کرنے سے (یہ سمجھتے ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے) انکار کر دیا جائے اگرچہ باقی سب احکام کو تسلیم کرے اور پورے اہتمام سے سب پر عامل بھی ہو۔

اور وجہ یہ ہے کہ کفر و ارتداد حضرت مالک الملک و المملکت کی بغاوت کا نام ہے اور سب جانتے ہیں کہ بغاوت جس طرح بادشاہ کے تمام احکام کی نافرمانی اور مقابلہ پر کھڑے ہو جانے کو کہتے ہیں، اسی طرح یہ بھی بغاوت ہی سمجھی جاتی ہے کہ کسی ایک قانونِ شاہی کی قانون شکنی کی جائے اگرچہ باقی سب احکام کو تسلیم کر لے۔

شیطان ابلیس جو دنیا میں سب سے بڑا کافر اور کافرِ گمراہ ہے اس کا کفر بھی اسی دوسری قسم کا کفر ہے کیونکہ اس نے بھی نہ تبدیل مذہب کیا نہ خدا تعالیٰ کے وجود قدرت وغیرہ کا انکار کیا نہ ربوبیت سے منکر ہوا صرف ایک حکم سے سرتابی کی جس کی وجہ سے ابدالآباد کے لیے مطر و دملعون ہو گیا۔

حافظ ابن تیمیہ الصارم المسلمول ص: ۳۶۷ میں فرماتے ہیں:

كما أن الردة تتجرد عن السب فكذلك تتجرد عن قصد تبديل

الدين وإرادة التکذيب بالرسالة كما تجرد كفر ابليس عن قصد التکذيب بالربوبية۔

جیسا کہ ارتداد بغیر اس کے بھی ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ یا اس کے رسول کی شان میں سب و شتم سے پیش آوے اسی طرح بغیر اس کے بھی ارتداد متحقق ہو سکتا ہے، کہ آدمی تبدیل مذہب کا یا تکذیب رسول کا قصد کرے جیسا کہ ابلیس لعین کا کفر تکذیب ربوبیت سے خالی ہے۔

الغرض ارتداد صرف اسی کو نہیں کہتے کہ کوئی شخص اپنا مذہب بدل دے یا صاف طور پر خدا و رسول کا منکر ہو جائے بلکہ ضروریاتِ دین کا انکار کرنا اور قطعی الثبوت والدلالة احکام میں سے کسی ایک کا بعد علم انکار کر دینا بھی اسی درجہ کا ارتداد اور کفر ہے۔

تنبیہ: ہاں اس جگہ دو باتیں قابل خیال ہیں اول تو یہ کہ کفر و ارتداد اس صورت میں عائد ہوتا ہے جب کہ حکم قطعی کے تسلیم کرنے سے انکار اور گردن کشی کرے اور اس حکم کے واجب التعمیل ہونے کا عقیدہ نہ رکھے، لیکن اگر کوئی شخص حکم کو تو واجب التعمیل سمجھتا ہے مگر غفلت یا شرارت کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کرتا، تو اس کو کفر و ارتداد نہ کہا جائے گا اگرچہ ساری عمر میں ایک دفعہ بھی اس حکم پر عمل کرنے کی نوبت نہ آئے بلکہ اس شخص کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا، اور پہلی صورت میں کہ کسی حکم قطعی کو واجب التعمیل ہی نہیں جانتا اگرچہ کسی وجہ سے وہ ساری عمر اس پر عمل بھی کرتا رہے، تو بھی کافر و مرتد قرار دیا جائے گا، مثلاً ایک شخص پانچوں وقت کی نماز کا شدت کے ساتھ پابند ہے مگر فرض اور واجب التعمیل نہیں جانتا یہ کافر ہے اور دوسرا شخص جو فرض جانتا ہے مگر کبھی نہیں پڑھتا وہ مسلمان ہے، اگرچہ فاسق و فاجر اور سخت گناہ گار ہے۔

قطعی الثبوت و قطعی الدلالة کی تشریح

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے احکام اسلامیہ کی مختلف قسمیں ہو گئی ہیں۔ تمام اقسام کا اس بارے میں ایک حکم نہیں، کفر و ارتداد صرف ان احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثبوت بھی ہوں اور قطعی الدلالة بھی۔

قطعی الثبوت ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ان کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث سے ہو جن کے روایت کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہوں کہ ان سب کا جھوٹی بات پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے (اسی کو اصطلاح حدیث میں تواتر اور ایسی احادیث کو احادیث متواترہ کہتے ہیں)۔

اور قطعی الدلالة ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے، یا حدیث متواترہ سے ثابت ہوئی ہے، وہ اپنے مفہوم و مراد کو صاف صاف ظاہر کرتی ہو اس میں کسی قسم کی الجھن نہ ہو کہ جس میں کسی کی تاویل چل سکے۔

قطعیات و ضروریات دین کا فرق

پھر اس قسم کے احکام قطعیہ اگر مسلمانوں کے ہر طبقہ خاص و عام میں اس طرح مشہور و معروف ہو جائیں کہ ان کا حاصل کرنا کسی خاص اہتمام اور تعلیم و تعلم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو ورثہ وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا چوری، شراب خوری کا گناہ ہونا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا وغیرہ تو ایسے احکام قطعیہ کو ضروریات دین کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں ضروریات نہیں۔

اور ضروریات اور قطعیات کے حکم میں یہ فرق ہے، کہ ضروریات دین کا انکار باجماع امت مطلقاً کفر ہے، ناواقفیت و جہالت کو اس میں عذر نہ قرار دیا جائے گا، اور نہ کسی کی تاویل سنی جائے گی۔

اور قطعیات محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہیں پہنچتے تو حنفیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی عامی آدمی بوجہ ناواقفیت و جہالت کے ان کا انکار کر بیٹھے تو ابھی اس کے کفر و ارتداد کا حکم نہ کیا جائے گا، بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائے گی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالة احکام میں سے ہے اس کا انکار کفر ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب کفر کا حکم کیا جائے گا۔

كما في المسامرة والمسامرة لابن الهمام ولفظه واما ما ثبت قطعاً ولم يبلغ حد الضرورة كاستحقاق بنت الابن السدس مع البنت الصلبية باجماع المسلمين فظاهر كلام الحنفية الا كفار يجحدونه بانهم لم يشترطوا في الا كفار سوى القطع في الثبوت (الى قوله) ويجب حملة على ما اذا علم المنكر ثبوته قطعاً۔ (مسامرة ص: ۱۴۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچا ہو جیسے (میراث میں) اگر پوتی اور بیٹی حقیقی جمع ہوں تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماع امت سے ثابت ہے، سو ظاہر کلام حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جائے کیونکہ انہوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی (الی قولہ) مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اس صورت پر محمول کیا جائے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح کفر و ارتداد کی ایک قسم تبدیل مذہب ہے اسی طرح دوسری قسم یہ بھی ہے کہ ضروریات دین اور قطعیات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریات دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے ان کے معروف

معانی کے خلاف معنی پیدا ہو جائیں اور غرض معروف بدل جائے، اور ارتداد کی اس قسم دوم کا نام قرآن کی اصطلاح میں الحاد ہے۔

قال تعالى: إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا. (الآية)

ترجمہ: جو لوگ ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔

اور حدیث میں اس قسم کے ارتداد کا نام زندقہ رکھا گیا ہے جیسا کہ صاحب مجمع البحار نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اتى على بن نادقة هى جمع زنديق (الى قوله) ثم استعمل فى كل ملحد فى الدين والمراد ههنا قوم ارتدوا عن الاسلام۔

(مجمع البحار: ۶۹۵)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس چند زنداقہ (گرفتار کر کے) لائے گئے، زنداقہ جمع زندیق ہے اور لفظ زندیق ہر اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو دین میں الحاد (یعنی بے جا تاویلات) کرے اور اس جگہ مراد ایک مرتد جماعت ہے۔

اور علمائے کلام اور فقہاء اس خاص قسم ارتداد کا نام باطیت رکھتے ہیں اور کبھی وہ بھی زندقہ کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

شرح مقاصد میں علامہ تفتازانی اقسام کفر کی تفصیل اس طرح نقل فرماتے ہیں:

”یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ کافر اس شخص کا نام ہے جو مومن نہ ہو، پھر اگر وہ ظاہر میں ایمان کا مدعی ہو تو اس کو منافق کہیں گے، اور اگر مسلمان ہونے کے بعد کفر میں مبتلا ہوا ہے تو اس کا نام مرتد رکھا جائے گا، کیونکہ وہ اسلام سے پھر گیا ہے اور اگر دو یا دو سے زیادہ معبودوں کی پرستش کا قائل ہو تو اس کو مشرک کہا جائے گا، اور اگر ادیان منسوخہ یہودیت و عیسائیت وغیرہ میں کسی مذہب کا پابند ہو تو اس کو کتابی کہیں گے، اور اگر عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہو اور تمام واقعات و حوادث کو زمانہ کی طرف منسوب کرتا ہو تو

اس کو دہریہ کہا جائے گا، اور اگر وجود باری تعالیٰ ہی کا قائل نہ ہو تو اس کو معطل کہتے ہیں، اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اقرار اور شعائر اسلام نماز، روزہ وغیرہ کے اظہار کے ساتھ کچھ ایسے عقائد رکھتا ہو جو بالاتفاق کفر ہیں تو اس کو زندیق کہا جاتا ہے۔

(ترجمہ عبارت شرح مقاصد ۲/۲۶۸، ۲۶۹، و مثلاً فی کلیات ابی البقاء: ۵۵۳، ۵۵۴)

زندیق کی تعریف میں جو عقائد کفریہ کا دل میں رکھنا ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مثل منافق کے اپنا عقیدہ ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ مراد ہے کہ اپنے عقیدہ کفریہ کو ملمع کر کے اسلامی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

كما ذكره الشامي حيث قال فان الزنديق يموه كفره ويروج عقيدته الفاسدة ويخرجها في الصورة الصحيحة وهذا معنى ابطان الكفر فلا ينال في اظهاره الدعوى۔ (شامی باب المرتد ۳/۴۵۸)

ترجمہ: علامہ شامی نے فرمایا ہے کہ زندیق اپنے کفر پر ملمع سازی کرتا ہے اور اپنے عقیدہ فاسدہ کو رائج کرنا چاہتا ہے اور اس کو عمدہ صورت میں ظاہر کرتا ہے اور زندیق کی تعریف میں جو یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے کفر کو چھپاتا ہے اس کا یہی مطلب ہے (کہ وہ اپنے کفر کو ایسے عنوان اور صورت میں پیش کرتا ہے جس سے لوگ مغالطہ میں پڑ جائیں) اس لیے یہ اخفاء کفر اظہار دعویٰ کے منافی نہیں۔

کفر کی اقسام مذکورہ بالا میں سے آخری قسم اس جگہ زیر بحث ہے جس کے متعلق شرح مقاصد کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جس طرح اقسام سابقہ کفر کے انواع ہیں اسی طرح یہ صورت بھی اسی درجہ کا کفر ہے کہ کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے احکام کو تسلیم کرنے کے باوجود صرف بعض احکام و عقائد میں اختلاف رکھتا ہو اگرچہ دعویٰ مسلمان ہونے کا کرے اور تمام ارکان اسلام پر شدت کے ساتھ عامل بھی ہو۔

”اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں“ اس کی تشریح

یہ بات عام طور پر مشہور ہے اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں اور کتب فقہ و عقائد میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، نیز بعض احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے۔

کما رواہ ابو داؤد فی الجہاد عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلث من اصل الإیمان الکف عمن قال لا الہ الا اللہ ولا تکفرہ بذنب ولا تخرجه من الاسلام بعمل الحدیث۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی اصل تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو شخص کلمہ لا الہ الا اللہ کا قائل ہو اس کے قتل سے باز رہو، اور کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو، اور کسی عمل بد کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہ قرار دو۔

اس لیے مسئلہ زیر بحث میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جو شخص نماز روزہ کا پابند ہے وہ اہل قبلہ میں داخل ہے تو پھر بعض عقائد میں خلاف کرنے یا بعض احکام کے تسلیم نہ کرنے سے اس کو کیسے کافر کہا جاسکتا ہے۔ اور اسی شبہ کی بنیاد پر آج کل بہت سے مسلمان قسم ثانی کے مرتدین یعنی ملحدین و نادقہ کو مرتد و کافر نہیں سمجھتے، اور یہ ایک بھاری غلطی ہے جس کا صدمہ براہ راست اصول اسلام پر پڑتا ہے۔ کیونکہ میں اپنے کلام سابق میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر قسم دوم کے ارتداد کو ارتداد نہ سمجھا جائے تو پھر شیطان کو بھی کافر نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس شبہ کے منشاء کو بیان کر کے اس کا شافی جواب ذکر کیا جائے۔

اصل اس کی یہ ہے کہ شرح فقہ اکبر وغیرہ میں امام اعظم ابو حنیفہؒ سے اور حواشی شرح عقائد میں شیخ ابوالحسن اشعریؒ سے اہل سنت والجماعت کا یہ مسلک نقل کیا گیا ہے۔

ومن قواعده اهل السنة والجماعة ان لا یکفر واحد من اهل القبلة

(کذا فی شرح العقائد النسفیة ص: ۱۲۱) وفی شرح التحریر:

۳۱۸/۳ وسیاقها عن ابی حنیفۃؒ ولا نکفر اهل القبلة بذنب انتہی فقیہہ بالذنب فی عبارة الامام واصله فی حدیث ابی داؤد کما مر آنفاً۔

اہل سنت والجماعت کے قواعد میں سے ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی شخص کی تکفیر نہ کی جائے (شرح عقائد نسفی) اور شرح تحریر ۳۱۸/۳ میں ہے کہ یہ مضمون امام اعظم ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے، سو اس میں بذنب کی قید موجود ہے اور غالباً یہ قید حدیث ابو داؤد کی بناء پر لگائی گئی ہے جو ابھی گزر چکی ہے۔

جس کا صحیح مطلب تو یہ ہے کہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر مت کہو خواہ کتنا ہی بڑا گناہ ہو (بشرطیکہ کفر و شرک نہ ہو) کیونکہ گناہ سے مراد اس جگہ پر وہی گناہ ہے جو حد کفر تک نہ پہنچا ہو۔

کما فی کتاب الإیمان لابن تیمیۃ حیث قال ونحن اذا قلنا اهل السنة متفقون علی ان لا یکفر بالذنب فانما نرید به المعاصی کالزنا والشرب انتہی و اوضحه القونوی فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ۔

جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں ہے کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اس پر متفق ہیں کہ اہل قبلہ میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہیں تو اس جگہ گناہ سے ہماری مراد معاصی مثل زنا و شراب خوری وغیرہ ہوتے ہیں اور علامہ قونوی نے عقیدۃ الطحاوی کی شرح میں اس مضمون کو خوب واضح کر دیا ہے۔

ورنہ پھر اس عبارت کے کوئی معنی نہیں رہتے اور لفظ بذنب کے اضافہ کی (جیسا کہ فقہ اکبر اور شرح تحریر کے حوالہ سے اوپر نقل ہوا ہے) کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

اب شبہات کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ بعض علماء کی عبارتوں میں اختصار کے

ضروریات الدین کحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله تعالى بالکلیات والجزئیات وما اشبه ذلك من المسائل المهمات فمن واطب طول عمره على الطاعات والعبادات مع اعتقاد قدم العالم ونفی الحشر او نفی علمه سبحانه وتعالى بالجزئیات لا یکون من اهل القبلة وان المراد بعدم تکفیر احد من اهل القبلة عند اهل السنة انه لا یکفر احد ما لم یوجد شیء من امارات الکفر وعلاماته ولم یصدر عنه شیء من موجباته۔

ترجمہ: خوب سمجھ لو کہ اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان تمام عقائد پر متفق ہوں جو ضروریات دین میں سے ہیں جیسے حدوث عالم اور قیامت وحشر ابدان اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام کلیات و جزئیات پر حاوی ہونا اور اسی قسم کے دوسرے عقائد ہمہ پس جو شخص تمام عمر طاعات و عبادات پر مداومت کرے مگر ساتھ ہی عالم کے قدیم ہونے کا معتقد ہو یا قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کا یا حق تعالیٰ کے علم جزئیات کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور یہ کہ اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ ان میں سے کسی شخص کو اس وقت تک کافر نہ کہیں جب تک اس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہو جو علامات کفر یا موجبات کفر میں سے ہے۔ اور شرح مقاصد بحث سابع میں مذکور الصدر مضمون کو مفصل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

فلا نزاع فی کفر اهل القبلة المواظب طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفی الحشر ونفی العلم بالجزئیات ونحو ذلك وكذلك بصدور شیء من موجبات الکفر عنه۔

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے اس شخص کو کافر کہا جائے گا جو اگر

مواقع میں بذنب کا لفظ بوجہ معروف و مشہور ہونے کے چھوڑ دیا گیا۔ اور مسئلہ کا عنوان عدم تکفیر اہل القبلة ہو گیا۔ حدیث وفقہ سے نا آشنا اور غرض متکلم سے ناواقف لوگ یہاں سے یہ سمجھ بیٹھے کہ جو شخص قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے لے اس کو کافر کہنا جائز نہیں، خواہ کتنے ہی عقائد کفریہ رکھتا ہو، اور اقوال کفریہ بکتا پھرے۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ اگر یہی لفظ پرستی ہے تو اہل قبلہ کے لفظوں سے تو یہ بھی نہیں نکلتا کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے بلکہ ان لفظوں کا مفہوم تو اس سے زائد نہیں کہ صرف قبلہ کی طرف منہ کر لے خواہ نماز بھی پڑھے یا نہ پڑھے، اگر یہ معنی مراد لئے جائیں تو پھر دنیا میں کوئی شخص کافر ہی نہیں رہ سکتا کیونکہ کبھی نہ کبھی ہر شخص کا منہ قبلہ کی طرف ہو ہی جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ اہل قبلہ کی مراد تمام اوقات و احوال کا استیعاب باستقبال قبلہ نہیں۔

اہل قبلہ کی تعریف و تشریح

خوب سمجھ لیجئے کہ لفظ اہل قبلہ ایک شرعی اصطلاح ہے جس کے معنی اہل اسلام کے ہیں اور اسلام وہی ہے جس میں کوئی بات کفر کی نہ ہو، لہذا یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو تمام ضروریات دین کو تسلیم کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر (بشرط ثبوت) ایمان لائیں۔ نہ ہر اس شخص کے لیے جو قبلہ کی طرف منہ کر لے۔ جیسے دنیا کی موجودہ عدالتوں میں اہل کار کا لفظ صرف ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو باضابطہ ملازم اور قوانین ملازمت کا پابند ہو۔ اس کے مفہوم لغوی کے موافق ہر کام والے آدمی کو اہل کار نہیں کہا جاتا۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا علم فقہ و عقائد کی کتابیں تقریباً تمام اس پر شاہد ہیں جن میں سے بعض عبارات درج ذیل ہیں۔

حضرت ملا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:

اعلم ان المراد باهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من

تنبیہ

کسی مسلمان کو کافر کہنے کے معاملہ میں آج کل ایک عجیب افراط و تفریط رونما ہے ایک جماعت ہے کہ جس نے مشغلہ یہی اختیار کر لیا ہے کہ ادنیٰ معاملات میں مسلمانوں پر تکفیر کا حکم لگا دیتے ہیں، اور جہاں ذرا سی کوئی خلاف شرع حرکت کسی سے دیکھتے ہیں تو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں۔ اور دوسری طرف تو تعلیم یافتہ آزاد خیال جماعت ہے جس کے نزدیک کوئی قول و فعل خواہ کتنا ہی شدید اور عقائد اسلامیہ کا صریح مقابل ہو کفر کہلانے کا مستحق نہیں، وہ ہر مدعی اسلام کو مسلمان کہنا فرض سمجھتے ہیں اگرچہ اس کا کوئی عقیدہ اور عمل اسلام کے موافق نہ ہو اور ضروریات دین کا انکار کرتا ہو، اور جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا ایک سخت پُر خطر معاملہ ہے اسی طرح کافر کو مسلمان کہنا بھی اس سے کم نہیں کیونکہ حدود کفر و اسلام میں التباس بہر دو صورت لازم آتا ہے اس لیے علماء امت نے ہمیشہ ان دونوں معاملوں میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے، امراول کے متعلق تو یہاں تک تصریحات ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی کام خلاف شرع صادر ہو جائے اور اس کلام کی مراد میں محاورات کے اعتبار سے چند احتمال ہوں اور سب احتمالات میں یہ کلام ایک کلمہ کفر بنتا ہو لیکن صرف ایک احتمال ضعیف ایسا بھی ہو کہ اگر اس کلام کو اس پر حمل کیا جائے تو معنی کفر نہیں رہتے بلکہ عقائد حقہ کے مطابق ہو جاتے ہیں تو مفتی پر واجب ہے کہ اسی احتمال ضعیف کو اختیار کر کے اس کے مسلمان ہونے کا فتویٰ دے جب تک کہ خود وہ متکلم اس کی تصریح نہ کرے کہ میری مراد یہ معنی نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی ایسے عقیدہ کا قائل ہو جائے جو ائمہ اسلام میں سے اکثر لوگوں کے نزدیک کفر ہو لیکن بعض ائمہ اس کے کفر ہونے کے قائل نہ ہوں تو اس کفر مختلف فیہ سے بھی مسلمان پر کفر کا حکم کرنا جائز نہیں (صرح بی فی البحر الرائق باب المرتدین جلد ۵)

چہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزارے مگر عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد رکھے یا قیامت و حشر کا یا حق تعالیٰ کے عالم جزئیات ہونے کا انکار کرے اسی طرح وہ شخص جس سے کوئی چیز موجب کفر میں سے صادر ہو جائے۔

اور علامہ شامی نے رد المحتار باب الامامة جلد اول میں بحوالہ تحریر الاصول نقل فرمایا ہے: لا خلاف فی کفر المخالف من اهل القبلة. (ای للضروریات) المواظب طول عمره علی الطاعات کما فی شرح التحرير. (۳۷۷/۱) ترجمہ: اس میں کسی کا خلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو وہ کافر ہے اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزار دے۔ اور شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس ص: ۵۷۲ میں ہے:

اهل القبلة فی اصطلاح المتکلمین من یرصد بضروریات الدین الی قوله فمن انکر شیئاً من الضروریات (الی قوله) لم یکن من اهل القبلة ولو کان مجاہداً بالطاعات و کذلک من باشر شیئاً من أمارات التکذیب کسجود الصنم والإهانة بامر شرعی والإستهزاء علیہ فلیس من اهل القبلة ومعنی عدم تکفیر اهل القبلة ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیة غیر المشهورة هذا ما حققه المحققون.

اہل قبلہ متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو تمام ضروریات دین کی تصدیق کرے پس جو شخص ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اگرچہ عبادت و اطاعت میں مجاہدات کرنے والا ہو، ایسے ہی وہ شخص جو علامات کفر و تکذیب میں سے کسی چیز کا مرتکب ہو جیسے بُت کو سجدہ کرنا یا کسی امر شرعی کی اہانت و استہزاء کرنا وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہیں اور نہ ایسے امور کے انکار کی وجہ سے کافر کہیں جو اسلام میں مشہور نہیں یعنی ضروریات دین میں سے نہیں۔

ومثله فی ردالمحتار وجامع الفصولین من باب کلمات الکفر۔

اور امر دوم کے متعلق بھی صحابہ کرام اور سلف صالحین کے تعامل نے یہ بات متعین کر دی کہ اس میں تہاوان و تکاسل کرنا اصول اسلام کو نقصان پہنچانا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے ان کا ارتداد قسم دوم ہی کا ارتداد تھا، صریح طور پر تبدیل مذہب (عموماً) نہ تھا لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان پر جہاد کرنے کو اتنا زیادہ اہم سمجھا کہ نزاکت وقت اور اپنے ضعف کا بھی خیال نہ فرمایا۔ اسی طرح مسیلمہ کذاب مدعی نبوت اور اس کے ماننے والوں پر جہاد کیا جس میں جمہور صحابہ شریک تھے، جن کے اجماع سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو شخص ختم نبوت کا انکار کرے یا نبوت کا دعویٰ کرے وہ مرتد ہے اگرچہ تمام ارکان اسلام کا پابند اور زاهد و عابد ہو۔

ضابطہ تکفیر

اس لیے تکفیر مسلم کے بارے میں ضابطہ شرعیہ یہ ہو گیا کہ جب تک کسی شخص کے کام میں تاویل صحیح کی گنجائش ہو اور اس کے خلاف کی تصریح متکلم کے کلام میں نہ ہو یا اس عقیدہ کے کفر ہونے میں ادنیٰ سے ادنیٰ اختلاف ائمہ اجتہاد میں واقع ہو، اس وقت تک اس کے کہنے والے کو کافر نہ کہا جائے لیکن اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی ہی تاویل و تحریف کرے جو اس کے اجماعی معانی کے خلاف معنی پیدا کر دے تو اس شخص کے کفر میں کوئی تاویل نہ کیا جائے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

تنبیہ ضروری

مسئلہ زیر بحث میں اس بات کا ہر وقت خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک ہے۔ اس میں بے باکی اور جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے مسئلہ کی

دونوں جانب نہایت احتیاط کی مقتضی ہیں کیونکہ جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا وبال عظیم ہے اور حسب تصریح حدیث اس کہنے والے کے کفر کا اندیشہ قوی ہے، اسی طرح کسی کافر کو مسلمان کہنا یا سمجھنا بھی اس سے کم نہیں جیسا کہ عبارت شفاء سے منقول ہے اور شفاء میں مسئلہ کی نزاکت کو بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

ولمثل هذا ذهب ابو المعالی فی اجوبته الی محمد عبد الحق وکان سألہ عن المسألة فاعتذر له بان الغلط فیہ یصعب لان ادخال کافر فی الملة الاسلامیة او اخراج مسلم عنها عظیم فی الدین (شرح شفا فصل فی تحقیق القول فی اکفار المتأولین ۲/۵۰۰)

ابو المعالی نے جو محمد عبد الحق کے سوالات کے جواب لکھے ہیں ان میں ان کا بھی یہی مذہب ثابت ہے کیونکہ ان سے ایسا ہی سوال کیا گیا تھا جس کے جواب میں انہوں نے عذر کر دیا کہ اس بارہ میں غلطی سخت مصیبت کی چیز ہے کیونکہ کسی کافر کو مذہب اسلام میں داخل سمجھنا مسلمان کو اس سے خارج سمجھنا دین میں بڑے خطرہ کی چیز ہے۔

اسی لیے ایک جانب تو یہ احتیاط ضروری ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی مبہم کلام سامنے آئے جو مختلف وجوہ کو محتمل ہو اور سب وجوہ سے عقیدہ کفریہ قائل کا ظاہر ہوتا ہو، لیکن صرف ایک وجہ ایسی بھی ہو جس سے اصطلاحی معنی اور صحیح مطلب بن سکے، گو وہ وجہ ضعیف ہی ہو، تو مفتی و قاضی کا فرض ہے کہ اس وجہ کو اختیار کر کے اس شخص کو مسلمان کہے۔ (کما صرح بہ فی الشفاء فی هذه الصفحة وبمثله صرح فی البحر وجامع الفصولین وغیرہ)۔

اور دوسری طرف یہ لازم ہے کہ جس شخص میں کوئی وجہ کفر کی یقیناً ثابت ہو جائے اس کی تکفیر میں ہرگز تاخیر نہ کرے اور نہ اس کے متبعین کو کافر کہنے میں دریغ کرے جیسا کہ علماء امت کی تصریحات محررہ بالا سے بخوبی واضح ہو چکا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔ (جواہر الفقہ ۱/۳۷۷)

رسم کو ترجیح دینا، کسی کے روبرو رکوع کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے سمجھنا اور کسی مہینہ کو منحوس سمجھنا وغیرہ۔

(معارف القرآن ۲/۴۳۰، سورہ نساء پ ۵)

شُرک اکبر کی حقیقت

شُرک کی حقیقت! اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے، قرآن کریم نے مشرکین کے اس قول کو جو وہ جہنم میں پہنچ کر کہیں گے، نقل کیا ہے:

”قَالُوا لَئِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ، اِذْ نُسَوِّدُكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ“
یعنی قسم خدا کی ہم کھلی گمراہی میں تھے، جب کہ ہم نے تم کو اللہ رب العالمین کے برابر قرار دے دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ مشرکین کا بھی یہ عقیدہ تو نہ تھا کہ ہمارے گڑھے ہوئے پتھر اس جہاں کے خالق اور مالک ہیں، بلکہ انہوں نے دوسری غلط فہمیوں کی بنا پر ان کو عبادت میں یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رکھا تھا، یہی وہ شرک تھا جس نے ان کو جہنم میں پہنچا دیا۔ (فتح الملہم)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات خالق رازق، قادر مطلق، عالم الغیب والشہادۃ وغیرہ میں کسی مخلوق کو اللہ کے برابر سمجھنا شرک ہے۔

(معارف القرآن ۲/۵۵۱، سورہ نساء پ ۵)

مخلوق کے لیے علم غیب کا قائل ہونا شرک ہے؟

”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظِلَّكُمْ عَلَى الْغَيْبِ“، الآیۃ۔ (سورہ آل عمران پ ۴)
اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ امور غیب پر بذریعہ وحی اطلاع ہر شخص کو

فصل

شرک کی تعریف اور اس کی چند صورتیں

قوله تعالیٰ: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ“ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لیے رکھنا یہ شرک ہے اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں:

علم میں شریک ٹھہرانا

یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے، نجومی، پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا، یا کسی بزرگ کے کلام میں خلل دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا یا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا۔

اشراک فی التصرف

یعنی کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مرادیں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا۔

عبادت میں شریک ٹھہرانا

کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھاوا چڑھانا کسی کے نام کی منت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول یا

نہیں دیتے البتہ اپنے انبیاء کا انتخاب کر کے ان کو دیتے ہیں۔

اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو انبیاء بھی علم غیب کے شریک اور عالم الغیب ہو گئے، کیونکہ وہ علم غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو اس میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو، کسی دوسرے کا دیا ہوا نہ ہو، دوسرے تمام کائنات ماضی و مستقبل کا علم محیط ہو، جس سے کسی ذرے کا علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امور غیبیہ بتلاتے ہیں وہ حقیقۃً علم غیب نہیں ہے بلکہ غیب کی خبریں ہیں، جو انبیاء کو دی گئی ہیں جن کو خود قرآن نے کئی جگہ انباء الغیب سے تعبیر فرمایا:

”مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ“۔ (معارف القرآن آل عمران پ ۲، ۱۳۹)

شرک اصغر کی حقیقت

سورہ کہف کی آخری آیت میں ”وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا“ کا شان نزول جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرک سے مراد شرک خفی یعنی ریا ہے۔

امام حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی اور اس کو صحیح علی شرط الشیخین فرمایا ہے، روایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی تھی، کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور غازیانہ عمل پہچانا جائے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرنے سے جہاد کا ثواب نہیں ملتا۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہی ہے کہ اس آیت میں جس شرک سے منع کیا گیا ہے وہ ریاکاری کا شرک خفی ہے اور یہ کہ عمل اگرچہ اللہ ہی کے لیے ہو مگر اس کے ساتھ کوئی

نفسانی غرض، شہرت و وجاہت کا جذبہ بھی شامل ہو تو یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے جو انسان کے عمل کو ضائع بلکہ مضرت رسا بنا دیتا ہے۔

حضرت محمود بن لبید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ریا۔ (رواہ احمد فی مسندہ) اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو نقل کر کے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی جزا عطا فرمائیں گے تو ریاکار لوگوں سے فرمادیں گے کہ تم اپنے عمل کی جزا لینے کے لیے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لیے تم نے یہ عمل کیا تھا، پھر دیکھو کہ ان کے پاس تمہارے لیے کوئی جزا ہے یا نہیں۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں شرکاء میں شریک ہونے سے غنی اور بالائز ہوں، جو شخص کوئی عمل نیک کرتا ہے پھر اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیتا ہے تو میں وہ سارا عمل اسی شریک کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس عمل سے بری ہوں اس کو تو خالص اسی شخص کا کر دیتا ہوں جس کو میرے ساتھ شریک کیا تھا۔ (رواہ مسلم)

اور حکیم ترمذی نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شرک کا ذکر فرمایا کہ ”ہو فیکم اخفی من دبیب النمل“ یعنی شرک تمہارے اندر ایسے مخفی انداز سے آجاتا ہے جیسے چیونٹی کی رفتار بے آواز، اور فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا کام بتلاتا ہوں کہ جب تم وہ کام کر لو تو شرک اکبر اور اصغر یعنی ریا سے سب سے محفوظ ہو جاؤ، تم تین مرتبہ روزانہ یہ دعاء کیا کرو:

”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ“۔ (معارف القرآن سورہ کہف پ ۱۶)

دکھلاوے کے لیے پیسے خرچ کرنا بھی شرک ہے

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ سَعَةً مِّنْ ثَمَرِهِمْ سِرًّا وَآخَرًا بِوَجْهِ اللَّهِ يُسْرِعُ اللَّهُ لَهُمْ أَجْرَهُمْ سَعَةً. (سورہ بقرہ ۲۷۱)

راستہ میں خود بھی خرچ نہیں کرتے، اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں البتہ لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتے رہتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے اللہ کی رضا اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے لوگ تو شیطان کے ساتھی ہیں۔ لہذا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کے ساتھی شیطان کا ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حقوق واجبہ میں کوتاہی کرنا بخل کرنا معیوب ہے اسی طرح لوگوں کو دکھانے کے لیے اور بے مقصد مصارف میں خرچ کرنا بھی بہت بُرا ہے، وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھانے کو نیکی کرتے ہیں ان کا وہ عمل عند اللہ مقبول نہیں ہوتا اور حدیث میں اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔

عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ انا اغنی الشُّرکاء عن الشُّرک، من عمل عملاً أشْرکَ فیہ معی غیری ترکتہ وشرکۃ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

وعن شداد بن اوس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی یرائی فقد أشْرک ومن صام یرائی فقد أشْرک ومن تصدق

یرائی فقد أشْرک. (احمد بحوالہ مشکوٰۃ)

شداد بن اوسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس نے نماز پڑھی دکھانے کے لیے تو اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا دکھانے کے لیے تو اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی صدقہ دیا دکھانے کے لیے تو اس نے شرک کیا۔

عن محمود بن لبید ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اخوف ما اخاف علیکم الشُّرک الا صغر، قالوا یا رسول اللہ وما الشُّرک الا صغر قال الریاء. (احمد بحوالہ مشکوٰۃ)

ترجمہ: محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے متعلق مجھے بہت زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا ہے، صحابہ نے پوچھا شرک اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ریاء۔ (معارف القرآن ۲/۴۱۷، سورہ نساء ۵)

ذبح لغیر اللہ بھی شرک ہے

”مَا أَهْلٌ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ“ کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم

چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع امت حرام ہے۔ اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جز سے انتفاع جائز نہیں کیونکہ یہ صورت آیت ”مَا أَهْلٌ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ“ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے یعنی

نیز اس صورت کی حرمت کے لیے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، نُصَب ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودات باطلہ کے لیے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللہ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ما اہل کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ اس کے بالمقابل آیا ہے جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے، اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لیے مگر بوقت ذبح اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شخی حکیم الامت) امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے ان کی عبارت یہ ہے:

وجرت عادة العرب بالصياح باسم المقصود بالذبيحة وغلب ذلك في استعمالهم حتى عبّر به عن النية اللتي هي علة التحريم. (تفسير قرطبي ۳۰۷/۲)

عرب کی عادت تھی کہ جس کے لیے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہے، اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔ امام قرطبی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی

اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذبوہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین و فقہاء نے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللہ کا مدلول صریح قرار دیا ہے جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:

فكل ما نودى عليه بغير اسم الله فهو حرام وان ذبح باسم الله تعالى حيث اجمع العلماء لو ان مسلماً ذبح ذبيحة وقصد بذبحه التقرب الى غير الله صار مرتداً، وذبيحته ذبيحة مرتد.

ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا وہ حرام ہے اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو اس لیے کہ علماء، فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا۔ نیز درمختار کتاب الذبائح میں ہے:

ذبح بقدم الامير نحوه كواحد من العظماء يحرم لانه اهل به لغير الله ولو ذكر اسم الله، واقره الشامي ۲۱۴/۵.

کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا کیونکہ وہ ما اہل بہ لغيرِ اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اور شامی نے اس کی تائید کی۔ اور بعض حضرات نے اس صورت کو مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللہ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

اہل کتاب کی تحقیق

اہل کتاب کا مصداق اور ان کے ذبیحہ کا حکم

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَلَلٌ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حَلَلٌ لَهُمْ.

(سورہ نساء: ۵)

یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے، اور تمہارا کھانا اہل کتاب کے لیے حلال۔

اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک کھانے سے مراد ذبیحہ جانور ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباس، ابوالدرداء، ابراہیم، قتادہ، سدی، ضحاک، مجاہد، رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہی منقول ہے (روح المعانی و بصاص) کیونکہ دوسری قسم کے کھانوں میں اہل کتاب اور بت پرست، مشرکین سب برابر ہیں کہ روٹی، آٹا، دال، چاول، پھل وغیرہ جن میں ذبح کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی بھی جائز طریقہ پر حاصل ہو تو مسلمان کو اس کا کھانا جائز ہے۔ اور مسلمانوں سے ان کو ملے تو ان کے لیے حلال ہے۔ اس لیے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمان کے لیے اور مسلمان کا ذبیحہ اہل کتاب کے لیے حلال ہے۔

اب اس جگہ چند مسائل قابل غور ہیں، اول یہ کہ اہل کتاب قرآن و سنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں، کتاب سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اہل کتاب ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور سے ایمان و عمل رکھتے ہوں، اس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کتاب کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا۔ وہ ہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو۔ اس لیے باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا بتصدیق قرآن یقینی ہو، جیسے تورات، انجیل،

ایک طویل حدیث نقل کی، جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہؓ سے سوال کیا کہ ام المؤمنین! ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا: اَمَّا مَا ذُبِحَ لِلْيَوْمِ فَلَا تَأْكُلُوا وَلَكِنْ كُلُوا مِنْ أَشْجَارِهِمْ۔

(تفسیر قرطبی ۲/۲۰۷)

جو جانور اس عید کے دن کے لیے ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ، لیکن ان کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اول تو اشتراک علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَا أَهْلًا بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ کے حکم میں ہے، دوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے، اس لیے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَا أَهْلًا بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بخیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے، اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو نص قرآن حرام ہے، جیسا کہ مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ میں انشاء اللہ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا۔ (معارف القرآن ۲۲۱/۱ تا ۲۲۳، سورہ بقرہ پ ۲)

مَوَاضِعُہ اور یہ بھی فرمایا کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قَالَتِ الْيَهُودُ عَزِيرُ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ان حالات و صفات کے باوجود جب قرآن نے ان کو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جب تک یہودیت و نصرانیت کو بالکل نہ چھوڑ دیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں، خواہ وہ کتنے ہی عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں۔

امام بصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی یہود کی طرح کرتے ہیں، مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تحریر فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

آج کل نام کے یہود و نصاریٰ درحقیقت دہریے ہیں

آج کل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی مردم شناری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں۔ نہ تورات و انجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی و پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص مردم شناری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

نصاریٰ کے بارے میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے کہ:

روى ابن الجوزى بسنده عن علي قال لا تأكلوا من ذبائح نصارى بنى تغلب فانهم لم يتمسكوا من النصرانية بشيء الا شرابهم الخمر

زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ۔ اس لیے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں، وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی جیسے مشرکین مکہ مجوس، بت پرست ہندو، بدھ، آریہ، سکھ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو تورات و انجیل پر ایمان رکھنے والے ہیں، وہ باصلاح قرآن اہل کتاب میں داخل ہیں۔

تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں، جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبور داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہل کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور سے ان کا کوئی تعلق نہیں یہ نجوم پرست قوم ہیں، وہ ان کو بت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں۔ بہر حال یقینی طور پر جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں، تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے اور سمجھنے کے لیے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر عمل رکھتے ہوں، یا محض تورات، اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ و مریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں، سو قرآن کریم کی بے شمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس کی اتباع کرنے کے دعویدار ہوں۔ خواہ وہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں۔

قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا انہیں کے بارے میں یہ بھی جا بجا ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں۔ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ

فصل

بدعت کی تعریف اور اس کی حقیقت

اصل لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں خواہ عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اور اصطلاح شرع میں ہر ایسے نو ایجاد طریقہ عبادت کو بدعت کہتے ہیں، جو زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک میں اس کا داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہو نہ فعلاً نہ صراحۃً نہ اشارۃً، بدعت کی یہ تعریف علامہ برکوئی کی کتاب الطریقة المحمدیۃ، اور علامہ شاطبی کی کتاب ”الاعتصام“ سے لی گئی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ عادات اور دنیوی ضروریات کے لیے جو نئے نئے آلات اور طریقے روزمرہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں ان کا شرعی بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بطور عبادت اور بہ نیت ثواب نہیں کئے جاتے یہ سب جائز اور مباح ہیں، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کے مخالف نہ ہوں۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے قولاً ثابت ہو یا فعلاً صراحۃً یا اشارۃً وہ بھی بدعت نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کام کی ضرورت عہد رسالت میں موجود نہ تھی بعد میں کسی دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پیدا ہو گئی، وہ بھی بدعت میں داخل نہیں۔ جیسے مروجہ مدارس اسلامیہ اور تعلیمی تبلیغی انجمنیں اور دینی نشر و اشاعت کے ادارے اور قرآن وحدیث سمجھنے کے لیے صرف ونحو اور ادب عربی اور فصاحت و بلاغت کے فنون یا مخالف

ورواہ الشافعی بسند صحیح عنہ۔ (تفسیر مظہری ص: ۳۴، جلد ۳ ماندہ)

ابن جوزی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نصاریٰ بنی تغلب کے ذبا ح کو نہ کھاؤ، کیونکہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا، امام شافعی نے بھی سند صحیح کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں، نصرانی نہیں۔ اگرچہ نصرانی کہلاتے ہیں، اس لیے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا جمہور صحابہ و تابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں، بالکل دین کے منکر نہیں۔ اس لیے انہوں نے ان کا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

وقال جمہور الامۃ ان ذبیحۃ کل نصرانی حلال سواء کان من بنی تغلب او غیرہم و کذلک الیہود۔ (تفسیر قرطبی ۷/۸۷)

اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے، خواہ بنی تغلب میں سے ہو، یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت سے ہو، اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے، وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں، جس میں از روئے لغت عربی ہر قسم کی کھانے کی چیزیں داخل ہیں، لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مراد صرف اہل کتاب کے ذبا ح کا گوشت ہے، کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں، کھانے پینے کی خشک چیزیں، گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا حلال و جائز ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ (معارف القرآن سورہ ماندہ ۳/۲۸)

لیے تیجہ چہلم وغیرہ کی پابندی، رجب و شعبان وغیرہ کی متبرک راتوں میں خود ایجاد قسم کی نمازیں اور ان کے لیے چراغاں وغیرہ اور پھر ان خود ایجاد چیزوں کو فرض و واجب کی طرح سمجھنا ان میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت اور لعن طعن کرنا وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ درود و سلام، صدقہ و خیرات، اموات کو ایصال ثواب متبرک راتوں میں نماز و عبادت، نمازوں کے بعد دعا، یہ سب چیزیں عبادات ہیں، ان کی ضرورت جیسے آج ہے ایسے ہی عہد صحابہ میں بھی تھی، ان کے ذریعہ ثواب آخرت اور رضائے الہی حاصل کرنے کا ذوق و شوق جیسے آج کسی نیک بندے کو ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کو ان سب سے زائد تھا، کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو صحابہ کرام سے زائد ذوق عبادت اور شوق رضاء الہی حاصل ہے، حضرت حذیفہ بن یمانؓ فرماتے ہیں کہ کل عبادۃ لم يتعبدها أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا تعبدوها فان الاول لم يدع لآخر مقالا فاتقوا الله يا معشر المسلمين وخذوا بطريق من كان قبلکم۔ یعنی جو عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی وہ عبادت نہ کرو، کیونکہ پہلے لوگوں نے پچھلوں کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کو یہ پورا کریں اے مسلمانو! خدا تعالیٰ سے ڈرو اور پہلے لوگوں کے طریقے کو اختیار کرو، اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی منقول ہے۔

(الاعتصام للشاطبی ۳۱۰/۱، جواہر الفقہ ۴۵۸/۱)

بدعت حسنہ اور سیئہ کی حقیقت

صحیح حدیث میں ہے کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شرع میں ہر بدعت سیئہ اور گمراہی ہے، کسی بدعت اصطلاحی کو بدعت حسنہ نہیں کہا جاسکتا، البتہ لغوی معنی میں ہر نئی چیز کو بدعت کہتے

اسلام فرقوں کا رد کرنے کے لیے منطق اور فلسفہ کی کتابیں یا جہاد کے لیے جدید اسلحہ اور جدید طریقہ جنگ کی تعلیم وغیرہ کہ یہ سب چیزیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں مگر پھر بھی ان کو بدعت اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا سبب داعی اور ضرورت اس عہد مبارک میں موجود نہ تھی، بعد میں جیسی ضرورت پیدا ہوتی گئی علماء امت نے اس کو پورا کرنے کے لیے مناسب تدبیریں اور صورتیں اختیار کر لیں۔ (جواہر الفقہ ۴۵۸/۱)

احداث فی الدین اور احداث للدين کی تفصیل

اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب چیزیں نہ اپنی ذات میں عبادت ہیں نہ کوئی ان کو اس خیال سے کرتا ہے کہ ان میں زیادہ ثواب ملے گا بلکہ وہ چیزیں عبادت کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے عبادت کہلاتی ہیں گویا یہ احداث فی الدین نہیں بلکہ احداث للدين ہے اور احادیث میں ممانعت احداث فی الدین کی آئی ہے، احداث للدين کی نہیں یعنی کسی منصوص دینی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بضرورت زمان و مکان کوئی نئی صورت اختیار کر لینا ممنوع نہیں۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن کاموں کی ضرورت عہد رسالت میں اور زمان مابعد میں یکساں ہے ان میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں اس کو بدعت کہا جائے گا اور یہ از روئے قرآن و حدیث ممنوع و ناجائز ہوگا۔

مثلاً درود و سلام کے وقت کھڑے ہو کر پڑھنے کی پابندی، فقراء کو کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنے کے لیے کھانے پر مختلف سورتیں پڑھنے کی پابندی نماز باجماعت کے بعد پوری جماعت کے ساتھ کئی کئی مرتبہ دعاء مانگنے کی پابندی، ایصال ثواب کے

فاروق رضی اللہ عنہ کے ارشاد یا بعض بزرگوں کے ایسے کلمات کی آڑ لے کر طرح طرح کی بدعتیں بدعت حسنہ کے نام سے ایجاد کرنے والوں کے لیے اس میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے، بلکہ جو چیز اصطلاح شرع میں بدعت ہے وہ مطلقاً ممنوع و ناجائز ہے۔ البتہ بدعات میں پھر کچھ درجات ہیں، بعض سخت حرام قریب شرک کے ہیں، بعض مکروہ تحریمی بعض تنزیہی۔

(جواہر الفقہ ۶/۲۶۵)

بدعت کی تعریف اور اس کے اقسام و احکام کا خلاصہ

بدعت لغت میں ہر نئے کام کو کہتے ہیں خواہ عادت ہو یا عبادت، جن لوگوں نے یہ معنی لیے ہیں انہوں نے بدعت کی تقسیم دو قسم میں کی ہے، سیئہ اور حسنہ، جن فقہاء کے کلام میں بعض بدعت کو حسنہ کہا گیا ہے وہ اس معنی لغوی کے اعتبار سے بدعت ہیں، ورنہ درحقیقت بدعت نہیں۔

اور معنی شرعی بدعت کے یہ ہیں کہ دین میں کسی کام کا زیادہ یا کم کرنا جو قرین صحابہ تابعین کے بعد ہوا ہو، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے کرنے کی اجازت منقول نہ ہو، نہ قولاً نہ فعلاً نہ صراحۃً نہ اشارۃً۔

هذا ملخص ما في الطريقة المحمدية وهو أجمع ما رأيت من تعريف البدعة، وإن أردت التفصيل فراجع إلى بريقة. شرح الطريقة ۱/۲۸۱.

پھر بدعت میں درجات ہیں، بعض مکروہ کے درجہ میں ہیں، بعض حرام بعض شرک، اور مصر علی البدعة، بہر حال فاسق ہے، اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، کما فی الدر المختار وغیرہ۔

(امداد المفتیین فتاویٰ دارالعلوم ۲/۱۵۵)

ہیں اس اعتبار سے ایسی چیزوں کو بدعت حسنہ کہہ دیتے ہیں جو صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہیں تھی بعد میں کسی ضرورت کی بنا پر ان کو اختیار کیا گیا جیسے آج کل کے مدارس اسلامیہ اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم و فنون کہ دراصل بنیاد تعلیم اور درس اور مدرسہ کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، آپ نے خود فرمایا "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا"، یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ لیکن جس طرح کے مدارس کا قیام اور ان میں جس طرح کی تعلیم آج کل ضرورت زمانہ ضروری ہوگئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی آج ضرورت پیش آئی تو احیاء سنت کے لیے اس کو اختیار کیا گیا، جو تعریف بدعت کی اوپر لکھی جا چکی ہے اس کی رو سے ایسے اعمال بدعت میں داخل نہیں لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی ان کو بدعت کہہ دے تو بدعت حسنہ ہی کہا جائے گا۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے تراویح کی یکجا جماعت کو دیکھ کر اس معنی کے اعتبار سے فرمایا: نعمت البدعة هذه یعنی یہ بدعت تو اچھی ہے کیونکہ ان کو اور سب کو معلوم تھا کہ تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی اور پڑھائی اور زبانی اس کی تاکید کی اس لیے حقیقۃً اور شرعاً تو اس میں بدعت کا کوئی احتمال نہ تھا، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت کا ایسا اہتمام نہ کیا گیا تھا جو بعد میں حضور ہی کی تعلیم کے مطابق کیا گیا اس لیے ظاہری اور لغوی طور پر یہ کام بھی نیا تھا اس کو نعمت البدعة فرمایا، بدعت حسنہ کا اس سے زیادہ کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا من ابتدع بدعة يراها حسنة فقد زعم ان محمداً صلى الله عليه وسلم خان الرسالة لان الله تعالى يقول اليوم اكملت لكم دينكم فما لم يكن يومئذ ديناً لا يكون اليوم ديناً۔

(اعتصام ۱/۲۸)

غلو فی الدین کی تعریف اور اس کی مذمت

غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی امتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے، اسی لیے ہمارے آقا و مولا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس وباءِ عظیم سے بچانے کے لیے مکمل تدبیریں فرمائیں۔

حدیث میں ہے کہ حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمی جمرات کے لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کر لائیں۔ انہوں نے متوسط قسم کی کنکریاں پیش کر دیں، آپ نے ان کو بہت پسند فرما کر دو مرتبہ فرمایا: **بِمِثْلِهِنَّ بِمِثْلِهِنَّ** یعنی ایسی ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہئے پھر فرمایا: **”إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي دِينِهِمْ“**

یعنی غلو فی الدین سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی امتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں۔

اس حدیث سے چند اہم مسائل معلوم ہوئے اول یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں ان کی حد مسنون یہ ہے جو متوسط ہوں، نہ بہت چھوٹی ہوں، نہ بہت بڑی ہوں، بڑے بڑے پتھر اٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حد شرعی وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے متعین فرمادی اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

تیسرے یہ واضح ہو گیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حد مسنون سے تجاوز کیا جائے۔

(معارف القرآن ۲۲/۲ سورہ نساء)

سنت اور بدعت کے حدود

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات، معاملات اور معاشرت سب ہی چیزوں میں اپنے قول و عمل سے اعتدال کی حدود و مقرر فرمادی ہیں اور ان سے پیچھے رہنا کوتاہی اور آگے بڑھنا گمراہی ہے، اسی لیے آپ نے بدعات اور محدثات کو بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے، ارشاد فرمایا:

كُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ.

یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔

بدعت اسی چیز کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں صراحتاً یا اشارۃً موجود نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے لکھا ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لیے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریف دین کا راستہ ہے، پچھلی امتوں میں یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کر لیے اور ہر آنے والی نسل ان میں اضافے کرتی رہی، یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا۔

(معارف القرآن ۲۲/۲ سورہ نساء)

بدعت کی مذمت و قباح قرآن کی روشنی میں

”إِنَّ الدِّينَ فَارَقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ“۔ (سورہ انعام)

یعنی وہ لوگ جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہ جتلانے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے۔

عائشہؓ سے فرمایا کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر ہے وہ اہل بدعت اور اپنی خواہشات و خیالات کے تابع نئے طریقے ایجاد کرنے والے ہیں، یہی مضمون حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔ اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کرنے کو بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

امام احمد، ابو داؤد، ترمذی وغیرہ نے بروایت عرباض بن ساریہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلافات دیکھیں گے، اس لیے (میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ) تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اسی کے مطابق ہر کام میں عمل کرو، نئے نئے طریقوں سے بچتے رہو، کیونکہ دین میں نئی پیدا کی ہوئی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر جدا ہو گیا اس نے اسلام کا قلاوہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ (رواہ ابو داؤد و احمد)

تفسیر مظہری میں ہے کہ جماعت سے مراد اس حدیث میں جماعت صحابہ ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور آپ کو قرآن عطا فرمایا، اور قرآن کے علاوہ دوسری وحی عطا فرمائی، جس کو حدیث یا سنت کہا جاتا ہے، پھر قرآن میں بہت سی آیات مشکل یا مجمل یا مبہم ہیں، ان کی تفسیر و بیان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ بیان کرنے کا وعدہ فرمایا: ”ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ“ کا یہی مطلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنت کی تفصیلات اپنے بلا واسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کو اپنے قول و عمل کے

اس آیت میں غلط راستوں پر پڑنے والوں کے متعلق اول تو یہ بتلادیا کہ اللہ کا رسول ان سے بری ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، پھر ان کو یہ وعید شدید سنائی کہ ان کا معاملہ بس خدا تعالیٰ کے حوالے ہے، وہی ان کو قیامت کے روز سزا دیں گے۔

دین میں تفریق ڈالنا اور فرقے بن جانا جو اس آیت میں مذکور ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اصول دین کے اتباع کو چھوڑ کر اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق یا شیطانی مکر و تلبیس میں مبتلا ہو کر دین میں کچھ نئی چیزیں بڑھا دے یا بعض چیزوں کو چھوڑ دے۔

دین میں بدعت ایجاد کرنے پر سخت وعید

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں کچھلی امتوں کے لوگ بھی داخل ہیں، جنہوں نے اپنے اصول دین کو ترک کر کے اپنی طرف سے کچھ چیزیں ملا دی تھیں، اور اس امت کے اہل بدعت بھی جو دین میں اپنی طرف سے بے بنیاد چیزوں کو شامل کرتے رہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:

”میری امت کو بھی وہی حالات پیش آویں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے، جس طرح کی بد اعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری امت کے لوگ بھی مبتلا ہوں گے، بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت کے تہتر فرقے ہو جاویں گے، جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے، صحابہ کرام نے عرص کیا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا ”مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ یعنی وہ جماعت جو میرے طریقہ پر اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گی وہ نجات پائے گی (اس روایت کو ترمذی، ابو داؤد نے بروایت ابن عمر نقل کیا ہے)۔“

اور طبرانی نے بسند معتبر حضرت فاروق اعظم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت

ذریعہ سکھلائیں، اس لیے جمہور صحابہ کا عمل پوری شریعت الہیہ کا بیان و تفسیر ہے۔

اس لیے مسلمان کی سعادت اسی میں ہے کہ ہر کام میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے اور جس آیت یا حدیث کی مراد میں اشتباہ ہو اس میں اس کو اختیار کرے جس کو جمہور صحابہ کرام نے اختیار فرمایا ہو۔

اسی مقدس اصول کو نظر انداز کر دینے سے اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے کہ تعامل صحابہ اور تفسیرات صحابہ کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے جو جی میں آیا اس کو قرآن و سنت کا مفہوم قرار دے دیا، یہی وہ گمراہی کے راستے ہیں جن سے قرآن کریم نے بار بار روکا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا اور اس کے خلاف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہ فخرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ آدمیوں پر میں لعنت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت کرے۔

ایک وہ شخص جس نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھادیا (یعنی خواہ کچھ الفاظ بڑھادیئے یا معنی میں ایسی زیادتی کر دی جو تفسیر صحابہ کے خلاف ہے)۔

دوسرے وہ شخص جو تقدیر الہی کا منکر ہو گیا۔

تیسرے وہ شخص جو امت پر زبردستی مسلط ہو جائے تاکہ عزت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے، اور ذلت دے دے اس شخص کو جس کو اللہ نے عزت دی ہے۔

چوتھے وہ شخص جس نے اللہ کے حرام کو حلال سمجھا یعنی حرم مکہ میں قتل و قتل کیا، یا شکار کھلا۔

پانچویں وہ شخص نے جس میری عمرت و اولاد کی بے حرمتی کی۔

چھٹے وہ شخص جس نے میری سنت کو چھوڑ دیا۔

(معارف القرآن ۵۰/۳، سورہ انعام پ ۸)

تحفۃ المفتی

افتاء واستفتاء کا بیان

باب (۱۰)

افتاء واستفتاء کا بیان

شعبہ افتاء اور فتویٰ نویسی کی اہمیت و افادیت

ایک روز آپ نے (یعنی حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے) فتویٰ کے ساتھ اس قدر شغف اور انسہاک کا سبب خود بیان فرمایا جس سے اس طرز عمل کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

فرمایا: دینی خدمت کے جتنے شعبے ہیں، ان میں سے فتویٰ وہ شعبہ ہے جس کا فائدہ نقد ظاہر ہو جاتا ہے، انسان تصنیف کرتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے لوگ پڑھیں گے؟

اسی طرح وعظ تقریر کرنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے بیان سے کوئی متاثر ہو کر اس کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرے گا یا نہیں؟

یہی حال تدریس کا ہے کہ طلبہ میں سے کتنے اس سے حقیقی فائدہ اٹھائیں گے، یہ معلوم نہیں ہوتا اس کے برخلاف مفتی کے پاس عموماً وہی شخص سوال بھیجتا ہے جسے دین کی طلب ہوتی ہے اور جو مفتی کے فتویٰ کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے۔

اور عام طور سے اس پر عمل کر بھی لیتا ہے اس لئے اس کا فائدہ اگرچہ بظاہر محدود ہے لیکن نقد اور متعین ہے، اس کے علاوہ اس خدمت میں شہرت طلبی وغیرہ کے مکائد نفس

دوسری خدمات کے مقابلہ میں کم ہیں اس لئے اس میں اجر و ثواب کی امید زیادہ ہے۔

(البلاغ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی ص: ۲۱۱، ص: ۲۳۰ و ۲۳۱)

فقہ و فتاویٰ کا کام بہت مشکل ہے

حضرت ممدوح مجالس حکیم الامت میں اپنے پیر و مرشد حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں کہ ”مجھے تو تمام علوم و فنون میں فقہ سب سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔“ (البلاغ از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ص ۲۱۸)

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل دقیق اور اہم ترین سمجھا گیا ہے، فقہ کی متماثل جزئیات اور ان کے متعلق احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے جو کہ ہر عالم و مدرس کے بس کی بات نہیں، جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن و ذکاوت میں خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادہ تفقہ نہ ہو۔ (البلاغ از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ص ۷۱)

فتویٰ کی اہلیت کے لئے کسی ماہر مفتی کی تربیت ضروری ہے

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ کی اہلیت مخصوص فقہی مسائل کو یاد کرنے یا فقہی کتابوں میں استعداد پیدا کر لینے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک مستقل فن ہے جس کے لئے کسی ماہر مفتی کی صحبت میں رہ کر باقاعدہ تربیت لینے کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی نے اس طرح فتویٰ کی تربیت حاصل نہ کی ہوگی اس وقت تک وہ خواہ دسیوں بار ہدایہ وغیرہ کا درس دے چکا ہو فتویٰ دینے کا اہل نہیں بنتا۔

علامہ ابن عابد بن شامیؒ نے بھی لکھا ہے کہ کسی ماہر مفتی سے تربیت لئے بغیر فتویٰ دینا مستند عالم کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔

(البلاغ از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ص ۲۰۶)

محض فقہ و فتویٰ کی کتابیں یاد کر لینے سے فتویٰ

کی اہلیت نہیں پیدا ہوتی

حضرت والد صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کر لینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے جنہیں جزئیات ہی نہیں، ان کی عبارتیں بھی از بر تھیں لیکن ان میں فتویٰ (نویسی) کی مناسبت نظر نہیں آئی، وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ”فقہ“ کے معنی سمجھ کے ہیں اور فقیہ جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔

(البلاغ ص ۴۱۸)

وہ کون سے غموض و اسرار ہیں جن کے بغیر فتویٰ کی

اہلیت نام تمام رہتی ہے

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب سے بارہا سنی اور ایک آدھ مرتبہ اس کی تشریح و تفصیل بھی سمجھنی چاہی کہ وہ کیا باتیں ہیں جو محض مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں، لیکن والد صاحب نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر وہ باتیں بیان میں آسکتیں تو پھر انہیں سیکھنے کے لئے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی، ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدون نہیں کیا جاسکتا اور نہ متعین الفاظ میں ان کی تعبیر و تشریح ممکن ہے۔

(البلاغ ص ۴۱۸)

ان باتوں کے حصول کا طریقہ

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر اس کے انداز فکر و نظر کا مشاہدہ کیا جائے۔

اس طرح مدت کے تجربے اور مشاہدے سے وہ انداز فکر خود بخود زیر تربیت شخص کی طرف منتقل ہوتا ہے بشرطیکہ جانین میں مناسبت ہو اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا چاہتا ہو۔ (البلاغ ص ۴۰۲)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا تحقیقی مزاج

آج کل سہولت پسندی کی وجہ سے حال عام طور سے یہ ہو گیا ہے کہ فتویٰ نویسی کے لئے عموماً ان ہی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے جن کا سوال باقاعدہ آتا ہے لیکن حضرت والد صاحب کی تحقیق و کاوش صرف انہی مسائل کی حد تک محدود نہ تھی جو آپ سے باقاعدہ پوچھے جاتے، اس کے بجائے آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی اور جب کبھی موقع ملتا آپ ان میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے، خواہ اس کے لئے آپ سے سوال نہ پوچھا گیا ہو۔ (البلاغ ص ۴۰۲)

حضرت مفتی صاحب کا مطالعہ

یہی وجہ ہے کہ آپ کا مطالعہ صرف شامی عالمگیری یا اسی طرح کی معروف و متداول کتب تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ کتابیں باقاعدہ پڑھی تھیں جنہیں آج کل کے اہل علم کو چھونے کی بھی نوبت نہیں آتی۔

مثلاً امام سرحی رحمۃ اللہ علیہ کی ”شرح السیر الکبیر“ وہ کتاب ہے جو باقاعدہ فقہی ابواب پر مرتب نہیں ہے اس کا اصل موضوع جنگ و صلح، جہاد، غیر مسلموں کے ساتھ

معمولی ہجوم کے باوجود خود اپنے قلم سے نقل فرمایا ہے۔

(مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ البلاغ ص ۴۰۳/۴۰۲)

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دوپہر کو جب مدرسہ میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا ہے تو میں اکثر دارالعلوم کے کتب خانہ میں چلا جاتا وہ وقت ناظم کتب خانہ کے بھی آرام کا ہوتا تھا اس لئے ان کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری وجہ سے چھٹی کے بعد تک بھی کتب خانہ میں بیٹھے رہیں چنانچہ میں نے انہیں بااصرار اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ دوپہر کے وقفہ میں جب وہ گھر جانے لگیں تو مجھے کتب خانہ کے اندر چھوڑ کر باہر سے تالا لگا کر جائیں، چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے تھے اور میں ساری دوپہر علم کے اس رزگا رنگ باغ کی سیر کرتا تھا۔

فرماتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو میری نظر سے نہ گزری ہو، اگر کسی کتاب کو میں نے پورا نہیں پڑھا تو کم از کم اس کی ورق گردانی ضرور کر لی تھی۔ (البلاغ ص ۳۶۷)

وقت کی قدر و قیمت

حضرت والد صاحب کو وقت کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا اور آپ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے تھے اور حتی الامکان کوئی لمحہ فضول جانے نہیں دیتے تھے۔ آپ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ آپ کے وقت کا کوئی حصہ ضائع چلا جائے، آپ سنت کے مطابق گھر والوں کے ساتھ ضروری اور بسا اوقات تفریحی گفتگو کے لئے بھی وقت نکالتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے دل میں کوئی الارم لگا ہوا ہے جو ایک مخصوص حد تک پہنچنے کے بعد آپ کو کسی اور کام کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، چنانچہ گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد آپ اپنے کام میں

تعلقات وغیرہ ہے لیکن ضمناً اس میں بہت سے اہم مسائل دوسرے ابواب سے متعلق بھی آگئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والد صاحب نے اس کا مکمل طور پر یا اس کے بہت بڑے حصہ کا مطالعہ فرمایا تھا، بہت سے بظاہر غیر متعلق مسائل اس کے حوالہ سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔

”شرح السیر الکبیر“ کے اس نسخہ پر جو آپ کے مطالعہ میں تھا جا بجا آپ کے قلم سے نوٹ ملتے ہیں۔ (البلاغ ص ۴۰۲)

فقہی رسائل کے دیکھنے اور ان کے جمع کرنے کا اہتمام

فقہ و فتویٰ کی عام کتابوں کے علاوہ آپ کو ان کتب اور رسائل سے بھی شغف تھا جو کسی خاص مسئلہ کی تحقیق کے لئے لکھے گئے ہوں، چنانچہ آپ علامہ ابن نجیم کے رسائل زینیہ، علامہ شامی کے رسائل ابن عابدین، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی صاحب، حضرت علامہ ظہیر احسن نیوی اور دوسرے علماء کے مجموعہ ہائے رسائل بڑی احتیاط کے ساتھ رکھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

چنانچہ آپ کی فقہ کی الماری میں کئی خانے اسی قسم کے رسائل سے بھرے ہوئے ہیں اور ان پر آپ کے قلم کی لکھی ہوئی یادداشتوں اور نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض الماری کی زینت ہی نہیں بلکہ آپ کے مطالعہ میں رہے ہیں، گفتگو کے دوران بارہا ایسا ہوتا کہ کسی موضوع پر بات چھڑتی تو آپ فرماتے کہ فلاں عالم نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے اس قسم کے رسائل کبھی کبھار چھپتے ہیں اور ایڈیشن ختم ہونے پر نایاب ہو جاتے ہیں، اس لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو جہاں کہیں اس طرح کا کوئی رسالہ ملتا آپ اسے غنیمت سمجھ کر خرید کر رکھتے تھے اور اگر خریدنا ممکن نہ ہوتا تو اسے نقل کرانے کا اہتمام کرتے تھے۔

چنانچہ آپ کے پاس متعدد رسائل ایسے ہیں جنہیں خود آپ نے مصروفیات کے غیر

فصل

متفرق فوائد

قابل تحقیق مسائل کی تحقیق کا خصوصی انتظام

آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی اور جب کبھی موقع ملتا آپ ان میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے خواہ اس کے لیے سوال نہ پوچھا گیا ہو۔ (البلاغ ص: ۴۰۲)

جہاں (خاص تحقیق کی) ضرورت پیش آتی تو اس خاص فتویٰ کو الگ کر لیتے اور آپ کے دستی بیگ میں ایک بڑا لفافہ عموماً رکھا رہتا تھا جس پر ”غور طلب فتاویٰ“ کا عنوان درج تھا، جب کبھی کسی مسئلہ میں شبہ ہوتا تو اس لفافہ میں چلا جاتا۔ (البلاغ ص: ۴۱۶)

علامہ شامیؒ کی غایت احتیاط اور بسا اوقات ان کی کتاب

سے تسلی نہ ہونے کا راز

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علامہ ابن عابدین شامیؒ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے سے پہلے کی کتابوں

مشغول ہو جاتے، سفر ہو یا حضر آپ کا قلم چلتا ہی رہتا، ریل گاڑی میں تو آپ ایسی روانی سے لکھتے تھے جیسے ہموار زمین پر بیٹھے ہوں اور تحریر میں کوئی خاص بگاڑ بھی عموماً پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حد یہ ہے کہ احقر نے آپ کو موٹر کار بلکہ موٹر رکشا تک میں بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ کار اور رکشہ کے جھٹکوں میں کچھ لکھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے مگر آپ ہلکے پھلکے خطوط اس میں بھی لکھ لیتے تھے، آپ اوقات کی وسعت کے لحاظ سے مختلف کاموں کی ایک ترتیب ہمیشہ ذہن میں رکھتے اور جتنا وقت ملتا اس کے لحاظ سے وہ کام کر لیتے جو اتنے وقت میں ممکن ہو، مثلاً اگر گھر میں آنے کے بعد کھانے کے انتظار میں چند منٹ مل گئے تو ان میں ایک خط لکھ لیا ایک روز فرمانے لگے مجھے بے کار وقت گزارنا انتہائی شاق معلوم ہوتا ہے انتہاء یہ ہے کہ جب قضاء حاجت کے لیے بیت الخلاء جاتا ہوں وہاں بھی خالی وقت گزارنا مشکل ہوتا ہے۔

(البلاغ ص: ۵۰۵، ۵۰۶، از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ)

نہیں مانتے کیونکہ قرآن و سنت کا اسلوب احکام کے بیان کرنے کے ساتھ وعظ و تذکیر کے پہلو کو بھی ساتھ لیے ہے، اور اس میں بعض الفاظ اسی نقطہ نظر سے بڑھائے جاتے ہیں لیکن فقہاء کی عبارتیں صرف قانونی انداز کی عبارتیں ہیں اس لیے ان عبارتوں میں مفہوم مخالف کا معتبر ہونا خود فقہائے حنفیہ نے تسلیم کیا ہے۔ (البلاغ ص: ۴۲۱)

فقہی عبارتوں کو سمجھنے اور ان کا مصداق متعین

کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا طرز عمل

فقہاء کے کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے قانونی مقتضیات پر غور کر کے نتیجہ نکالا جائے، لیکن ان الفاظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں بعض اوقات کئی احتمال ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار کرنے میں ایک فقیہ اور مفتی کو اپنی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔

بعض حضرات کسی لفظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں اس کے لغوی مفہوم اور ٹھیکہ منطقی نتائج کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے مسئلہ کی علت اور اس کا صحیح سیاق پس پشت چلا جاتا ہے اور بعض حضرات اس لفظ کے ٹھیکہ منطقی نتائج پر زور دینے کے بجائے اس سیاق کو مد نظر رکھتے ہیں، جن میں وہ بولا گیا ہے خواہ اس سے لفظ کے منطقی نتائج پورے نہ ہوتے ہوں ان دونوں میں سے حضرت والد صاحب کا مذاق دوسرے طرز عمل کے مطابق تھا، ایک مثال سے یہ بات واضح ہو سکے گی۔

فقہائے حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر نابالغ کا نکاح اس کے باپ دادا نے کیا ہو تو اسے خیار بلوغ حاصل نہیں ہوتا البتہ اس کے ساتھ ہی ”در مختار“ وغیرہ میں ایک استثناء مذکور ہے کہ:

إلا إذا كان الأب معروفا بسوء اختياره مجاناً وفسقاً.

میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو ان کو رفع کرنے کے لیے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں ”تا مل“ یا ”تدبر“ کہہ کر بری ہو جاتے ہیں اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتابوں سے مکمل شفا نہیں ہوتی۔

منہ الخالق اور فتاویٰ تنقیح الحامد یہ کی خصوصیت

لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ رد المحتار میں تو رہا ہے مگر چونکہ علامہ شامی نے البحر الرائق کا ”حاشیہ منہ الخالق“ اور تنقیح الحامد یہ بعد میں لکھا ہے اس لیے ان کتابوں میں مسائل زیادہ متح انداز میں آئے ہیں جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہو جاتی ہے۔

(البلاغ ص: ۴۲۱)

متون فقہ کی خصوصیات اور فقہی عبارات میں مفہوم مخالف

معتبر ہونے کا راز

فقہائے کرام نے فقہ کے جو متون مرتب فرمائے ہیں ان کی عبارتیں انتہائی جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہیں، چنانچہ متون میں کسی مسئلہ کو بیان کرنے کے لیے اتنے ہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جتنے ناگزیر ہوں، ان کا کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا بلکہ اس سے مسئلہ کی کسی نہ کسی شرط کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ قرآن و سنت کی نصوص میں تو مفہوم مخالف کو حجت

فقہ کے مشکل ابواب سے کامل مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ

احقر نے حضرت والد صاحب قدس سرہ سے خود سنا ہے کہ فقہ کے جو ابواب مجھے جتنے زیادہ مشکل معلوم ہوئے میں نے ان کی تحصیل میں اتنی ہی زیادہ کاوش کی، چنانچہ فرماتے تھے کہ مجھے شروع میں وقف کے مسائل سے زیادہ مناسبت نہیں تھی اور جب کبھی وقف کا کوئی سوال آتا تو مجھے اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی، اس کا علاج میں نے اس طرح کیا کہ وقف کے بارے میں جتنی کتابیں میسر آئیں ان کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیا، فقہ کی متداول کتب کے علاوہ امام خصاص کی ”کتاب الوقف“ اور ”الاسعاف فی حکم الاوقاف“ کا بھی مطالعہ کیا یہاں تک کہ میری عدم مناسبت انشراح میں تبدیل ہو گئی۔

اور اللہ تعالیٰ نے جن ابواب سے مجھے خصوصی مناسبت عطا فرمائی ان میں وقف بھی شامل ہے اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کی کتابوں میں سے جس کتاب نے وقف کے مسائل کو سب سے زیادہ شرح و بسط اور انضباط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ”فتاویٰ مہدویہ“ ہے۔ (البلاغ ص: ۴۰۲)

مفتی کے لیے ایک بیاض خاص کی ضرورت اور اس کی اہمیت

فتویٰ کے کام میں یہ صورت حال اکثر پیش آتی ہے کہ انسان کسی ایک مسئلہ کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے اور مطلوبہ مسئلہ نکلنے سے پہلے اس میں بہت سے دوسرے کارآمد مسائل نظر آ جاتے ہیں لیکن چونکہ اس وقت ان کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس لیے ان کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی اور مطلوبہ مسئلہ کی تلاش میں انہیں نظر انداز کر کے گذر جاتا ہے بعد میں جب کبھی ان مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے تو یاد کرتا ہے کہ یہ مسئلہ کہیں دیکھا ہے لیکن کیا؟ اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔

حضرت والد صاحب نے اس غرض کے لیے ضخیم بیاض بنائی ہوئی تھی اور اس کو

یعنی جب باپ فسق و فجور اور لالچ کی وجہ سے اولاد کی بدخواہی میں معروف ہو تو یہ حکم نہیں ہوگا بلکہ اس صورت میں اولاد کو خیار بلوغ حاصل ہوگا۔

یہاں فقہاء نے صرف اتنا نہیں فرمایا کہ باپ اولاد کا بدخواہ ہو بلکہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس بدخواہی میں معروف ہو، لہذا لفظ ”معروف“ کے قانونی مقتضیات پر عمل تو ضروری ہے لیکن جو حضرات ان قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں لفظ کے ٹھٹھ منطقی لوازم پر زور دیتے ہیں انہوں نے اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی شخص کو ”معروف بسوء الاختیار“ یعنی اولاد کی بدخواہی میں معروف اسی وقت کہا جائے گا جب اس نے کم از کم ایک مرتبہ اپنی کسی اولاد کا نکاح صرف لالچ کی بناء پر کر دیا ہو اور جس شخص نے اب تک اپنی کسی لڑکی کا نکاح اس طرح نہ کیا ہو وہ معروف بسوء الاختیار نہیں کہلا سکتا۔

لہذا اگر کوئی باپ پہلی بار اپنی لڑکی کا نکاح لالچ سے کر رہا ہو تو وہ سبب الاختیار تو ہے لیکن معروف بسوء الاختیار نہیں ہے اس لیے اس کی لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہوگا۔

ہاں اگر وہ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نکاح اسی طرح کرے تو چونکہ اب وہ معروف بسوء الاختیار بن گیا ہے اس لیے دوسری لڑکی کو خیار بلوغ مل جائے گا۔

لیکن حضرت والد صاحب نے جواہر الفقہ کے ایک رسالہ میں اس نقطہ نظر سے اختلاف فرمایا ہے، ان کا موقف یہ ہے کہ ”معروف بسوء الاختیار“ کی یہ منطقی تعبیر کہ جب تک کسی لڑکی کی کم از کم ایک بہن باپ کی بدخواہی کی بھینٹ نہ چڑھ چکی ہو اس وقت تک اسے خیار بلوغ حاصل نہ ہو، اس سیاق کے بالکل خلاف ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سیاق یہ ہے کہ اولاد کا خیار بلوغ باپ کی مظنونہ شفقت کے مد نظر ساقط کیا گیا تھا لیکن جب سوء اختیار سے اس شفقت کا فقدان ثابت ہو گیا تو خیار بلوغ لوٹ آئے گا۔

اس موقع پر فقہاء نے معروف بسوء الاختیار اس لیے استعمال کیا ہے کہ سوء اختیار کا فیصلہ کسی کی شخصی رائے سے نہیں ہونا چاہئے بلکہ باپ کی بدخواہی اتنی واضح ہونی چاہئے کہ وہ لوگوں میں اس حیثیت سے معروف ہو۔ (البلاغ ص: ۴۲۱ تا ۴۲۳)

فصل

آداب فتویٰ

فتویٰ لکھنے سے پہلے چند قابل لحاظ امور

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح کسی مسئلہ کا حکم معلوم کرنا ایک اہم کام ہے اسی طرح فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے، جس میں مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔

مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ اپنے مخالف کو زیر کرنا ہے۔

یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے ایسی صورت میں استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب ہوتا ہے مثلاً ایک مرتبہ سوال آیا کہ ہمارے مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انہیں ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟

سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے حضرت والد صاحب کو یہ غالب گمان ہو گیا کہ اس استفتاء کا مقصد امام صاحب کو حق کی دعوت دینا یا فہمائش کرنا نہیں بلکہ ان کی تحقیر اور ان کے بعض خلاف احتیاط امور کی تشہیر ہے چنانچہ حضرت والد صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کے ہیں ان سے کہئے وہ تحریر یا زبانی معلوم فرمائیں۔

فقہی ابواب پر مرتب کر کے ہر باب کے عنوان کے تحت کئی کئی صفحات سادے چھوڑ دیتے تھے اور طریقہ کار یہ تھا کہ جب کبھی مطالعہ کے دوران کوئی اہم مسئلہ یا نئی تحقیق نظر پڑتی تو اس کا خلاصہ یا کم از کم حوالہ اس بیاض میں متعلقہ باب کے تحت نوٹ کر لیتے تھے۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ اس کی پابندی تو نہ کر سکا کہ جب بھی کوئی اہم مسئلہ یا تحقیق نظر پڑے تو اس کا حوالہ ضرور درج کر لیا کروں لیکن ایک زمانہ تک اکثر و بیشتر اس پر عمل کرتا رہا، اس طرح آپ کے پاس نادر یا دداشتوں اور حوالوں کا بڑا اگر انقدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا اور ضرورت کے وقت اس میں بہت سی کام کی باتیں یا مفید حوالے مل جاتے تھے۔

جب ہم لوگوں نے فراغت کے بعد حضرت والد صاحب کی خدمت میں فتویٰ نویسی کی تربیت لینی شروع کی تو حضرت نے ہمیں بھی یہ نصیحت فرمائی تھی کہ اپنے پاس ایک ایسی بیاض بنا رکھیں، چنانچہ ہم نے بھی اس پر عمل کیا اور باوجودیکہ اس میں اندراجات کا التزام نہ ہو سکا لیکن جتنا کچھ ہوا اس کے فوائد محسوس کئے۔

(البلاغ ص: ۴۰۶)

اس طرح یہ ممکنہ فتنہ فرو ہو گیا۔ (البلاغ ص: ۲۲۴)

(۲) اسی طرح حضرت والد صاحب کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو ان کی ہمت شکنی کی جائے، کیونکہ ایک عرصہ سے لوگوں میں یہ مزاج ابھرا ہے کہ دین کے وہ عملی مسائل جن پر زندگی کی درستی اور آخرت کی نجات موقوف ہے ان سے تو غافل اور بے خبر رہتے ہیں اور بے فائدہ نظریاتی بحثوں میں نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر باقاعدہ محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جن سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحب ایسے سوالات کے جواب میں فتویٰ لکھنے کے بجائے ایسی نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پیدا ہو مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہئے۔

ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کی کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا کہ کیا وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہو گئے؟

آپ نے فرمایا مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟ غرض اگر عوام کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضہ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا یا نہیں؟ اصحاب کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مومن تھے یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل طاہر تھے یا نہیں؟

اور والد صاحب کو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سوالات بلا ضرورت محض بحث و مباحثہ کی خاطر پوچھے جارہے ہیں تو عموماً آپ ان کا جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے کہ

ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان و عمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، ان مسائل پر بحث و مباحثہ میں وقت صرف کرنے کے بجائے وہ کام کیجئے جو آخرت میں کام آئے اور بعض اوقات صرف اتنے جواب پر اکتفاء فرماتے کہ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ“۔

یعنی انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔ ایک مرتبہ ملک میں ”حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے مسئلہ پر بحث و مباحثہ کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ بستی بستی مناظرے منعقد ہونے لگے اور فریقین کی طرف سے مناظرانہ کتابوں کا ایک انبار تیار ہو گیا، حضرت والد صاحب کے پاس اس مسئلہ پر سوالات کی بھرمار ہوئی تو اس زمانہ میں آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ: اگر سوال کسی ذی علم کی طرف سے آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے کسی شبہ کو دور کرنا یا واقعۂ علمی تحقیق کرنا ہے تو آپ اس کا جواب حسب ضرورت اجمال یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے، لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے ان کا جواب یہ دیتے کہ مسئلہ کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لیے کوئی ضروری نہیں لہذا اس بحث میں پڑنے کے بجائے شریعت کے علمی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجئے۔

(البلاغ ص: ۲۲۵)

(۳) اسی طرح آپ نے بارہا فرمایا کہ مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس کے فتوے کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا، چنانچہ بعض اوقات کسی مسئلہ کا ٹھیک فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دے دینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی اور لوگ اپنی حدود پر قائم نہیں رہیں گے ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (البلاغ ص: ۲۲۶)

بذات خود کبھی کسی نے حرام نہیں کہا لیکن اس وقت چونکہ علماء کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ علوم و فنون یا انگریزی زبان تنہا نہیں آئیں گے بلکہ ملحدانہ عقائد و نظریات اور دین بیزاری کی وبا ساتھ لائیں گے جس کا مشاہدہ بعد میں سب کو ہو گیا، اس لیے شروع میں انہوں نے اس وبا کو روکنے کی تدبیر کی اور بہت سے مسلمانوں کا ایمان بچا لیا لیکن جب وبا عالمگیر ہو گئی تو پھر تدبیر بدل گئی اور وہ یہ کہ ان علوم و فنون یا اس زبان کو حتی الوسع ان بیماریوں سے پاک کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، غرض یہ مختلف حالات کی مختلف تدبیریں تھیں، ٹھیکہ معنی میں شرعی حکم کی تبدیلی نہیں۔ (البلاغ ص: ۴۷۷)

فتوے کی عبارت عام فہم ہونا چاہئے جس کو

مستفتی بآسانی سمجھ سکے

حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فتویٰ نویسی کے انداز میں بھی عام روش سے ہٹ کر اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اہم تبدیلیاں فرمائی ہیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کو یہ بات بھی مد نظر رکھنی چاہئے کہ اس فتوے کو مخاطب ٹھیک سمجھ لے اور نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو، پہلے زمانہ میں چونکہ علم دین کا چرچا تھا اور علماء کی کثرت تھی اس لیے لوگ علمی فقہی اصطلاح و اسلوب سے اتنے نامانوس نہ تھے، چنانچہ مفتی صاحب اپنے جواب میں بلا تکلف فقہی اصطلاحات استعمال کر لیتے تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا تھا، اس لیے بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک سمجھ لیتا تھا اور اگر کوئی بات خود نہ سمجھتا تو ہرستی میں ایسے لوگ تھے جو اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکیں۔

اب ہماری شامت اعمال سے حالت یہ ہو گئی ہے کہ علم دین اور فقہ سے مناسبت باقی نہیں رہی اور اہل علم کی تعداد بھی کم ہو گئی ہے اس لیے اب اگر سوال کرنے والا کوئی

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتویٰ کے بجائے مشورہ کے طور پر لکھنا چاہئے، ایسے موقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ ”فلاں عمل مناسب نہیں یا درست نہیں یا اس سے پرہیز کرنا چاہئے“۔

حالات و زمانہ کے بدل جانے سے حکم بدل جانے کی حقیقت

اسی ذیل میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اس قسم کے فتوے بعض اوقات زمانوں کے اختلاف سے بالکل بدل جاتے ہیں اس کی بنا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء اپنی مرضی سے احکام شریعت میں رد و بدل کرتے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ شرعی احکام کی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ حالات کے لحاظ سے نسخے اور تدبیر کی تبدیلی ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ سے کسی نے کہا کہ حضرت یہ کیا بات ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا تو اکابر علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کے فتوے دیئے۔

لیکن آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ مفاسد سے اجتناب کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں اس کے جواب میں حضرت علامہ عثمانی نے جو بات ارشاد فرمائی وہ لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔

فرمایا کہ یہ شرعی حکم کی تبدیلی نہ تھی بلکہ بات یہ ہے کہ جب کسی علاقہ پر کسی وبا کے مسلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اطباء ایسی تدبیریں بتاتے ہیں جن سے اس وبا کو روکا جاسکے۔

لیکن جب وبا آ جاتی ہے تو پھر معالجات کی تدبیر بدل جاتی ہے اور اس وقت ایسے نسخے بتائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ وہ بیماری آنے کے بعد شفا حاصل ہو، بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہوا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جدید علوم و فنون یا کسی زبان کی تحصیل کو

یہ تو ایک مثال تھی ورنہ حضرت والد صاحب نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی باریکیاں برقرار رہیں، اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے، چنانچہ جو حضرات آپ سے فتویٰ کی تربیت لیتے ان کو بھی آپ اس بات کی تاکید فرماتے اس کی باقاعدہ مشق کراتے اور ان کی عبارت کی اصلاح پر کافی وقت خرچ کرتے تھے۔ (البلاغ ص: ۴۲۸)

مفصل فتویٰ لکھنے کا طریقہ

مفصل فتوؤں میں بعض اوقات مسئلہ کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات پورے فتویٰ کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا، حضرت والد صاحب کا انداز فتویٰ نویسی جس کی آپ دوسروں کو بھی تاکید فرماتے تھے اس سے مختلف تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ فتویٰ میں مسئلہ کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئے تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کر لے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے، فتوے میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے اور دلائل اہل علم کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے ایک عام آدمی کو فتوے کے شروع ہی میں مختصر ایہ بات واضح طور سے معلوم ہونی چاہئے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصر جواب کیا ہے؟

اس جواب کے بعد اہل علم کے لیے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جوابات جتنی تفصیل سے چاہیں دے دیئے جائیں۔

عام آدمی ہو تو جواب کی عبارت اس کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہئے۔ مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملے لکھتے رہے ہیں کہ:

”مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگا۔“

اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوتا تھا لیکن اب اگر یہ جملہ کسی گریجویٹ بلکہ پی ایچ ڈی کے سامنے بھی آجائے تو وہ اس کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اور اس سے میراث کی تقسیم میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔

اول تو آج لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ میت کے ترکہ میں کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں چنانچہ عام طور سے میت کے ذاتی استعمال کی چھوٹی موٹی چیزوں بلکہ بعض اوقات گھر کے ساز و سامان تک کو ترکہ کی تقسیم میں شامل نہیں کیا جاتا، پھر نہ لوگوں کو حقوق متقدمہ علی الارث کا مطلب معلوم ہے اور نہ ان کے مصداق کا پتہ ہے اس لیے حضرت والد صاحب نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی کہ:

”صورت مسئلہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی زیور یا جائیداد یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں پھر اگر مرحوم کے ذمہ کچھ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے اور بیوی کا مہر اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ بھی دین میں شامل ہے، اس کو ادا کیا جائے۔“

پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر کے حق میں کی ہو تو (ایک بیٹا تین) ۱/۳ کی حد تک اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد جو ترکہ بچے اسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے۔“

غایت درجہ تحقیق و احتیاط کی ضرورت

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل دقیق ترین سمجھا گیا ہے فقہ کی متماثل جزئیات اور ان کے متعلقہ احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے جو کہ ہر عالم و مدرس کے بس کی بات نہیں جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن و ذکاؤ میں خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادہ تفقہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مکمل تحقیق کے باوجود استفتاء کے جوابات تحریر فرمانے میں غایت احتیاط سے کام لیا کرتے تھے۔ (البلاغ ص: ۱۲۷)

نیز حضرت مفتی صاحب جب تک مسئلہ کی پوری تحقیق نہ فرما لیتے اور اس تحقیق پر مکمل شرح صدر نہ ہو جاتا فتویٰ صادر نہ فرماتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اجتناب کا حکم صادر فرماتے۔ (البلاغ ص: ۱۲۷-۱۲۸)

اگر حضرت مفتی صاحب کو کسی مسئلہ میں تردد یا شبہ ہو جاتا تو سائلین کو دوسرے ائمہ فقہ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے مسئلہ دریافت کر کے عمل کرنے کی ترغیب فرماتے۔ (البلاغ ص: ۱۲۵)

خود بھی بعض مسائل میں دوسرے علماء سے استفادہ فرمایا کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے ذاتی مسائل میں تو اکثر رجوع فرمایا کرتے تھے۔ (البلاغ ص: ۱۲۸)

خود رائی سے اجتناب اور بڑوں و ہم عصروں

سے مشورہ کی ضرورت

خود رائی اور خود بینی سے والد صاحب کو سخت نفرت تھی، روزمرہ کے عام معاملات میں بھی اپنے چھوٹوں تک سے مشورہ لینے کے عادی تھے خصوصاً فتویٰ جو دنیا و آخرت کی نازک ذمہ داری تھی اس میں تو سبھی بزرگوں سے اور خصوصاً حضرت حکیم

چنانچہ حضرت والد صاحب کے فتوؤں میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ فتوے کے شروع یا اخیر میں بالکل نمایاں اور ممتاز طریقہ پر مسئلہ کا واضح جواب لکھ دیتے ہیں اور زیادہ تر یہ جواب شروع میں ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ قدیم فقہاء اور مفتی حضرات کا طریقہ یہی تھا اور ایک روز غالباً حضرت شاہ جلال صاحب تھائیسری کے بعض فتاویٰ دکھائے جو اپنے موضوع پر مفصل فتاویٰ تھے لیکن ان کا طریقہ یہی تھا کہ سائل نے کسی چیز کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ هَلْ يَجُوزُ؟ اس پر حضرت شاہ جلال صاحب نے شروع میں لکھا تھا ”الجواب نعم يجوز“ اور اس کے بعد دلائل کی مفصل بحث فرمائی تھی۔

حضرت والد صاحب نے اس کو بطور مثال پیش کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب ہے کہ پڑھنے والے کو سوال کا جواب ایک ہی لفظ سے مل گیا، اب اگر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے اور نہیں پڑھنا چاہتا ہے تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لیے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ (البلاغ ص: ۱۲۷)

سوال کے تجزیہ و تنقیح کی ضرورت

اسی طرح سوال بعض اوقات تہ در تہ ہوتا ہے اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو گڈ مڈ کر کے پوچھتا ہے۔

ایسے مواقع پر حضرت والد صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ جواب میں پہلے سوال کا تجزیہ خود فرما لیتے اور یہ تنقیح فرما دیتے کہ اس مسئلہ میں فلاں فلاں باتیں قابل غور ہیں پھر ان میں سے ہر ایک پر نمبر وار بحث فرماتے تھے۔ اس طرح مسئلہ کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ جاتے تھے، اور مسئلے کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی تھی۔ (ایضاً ص: ۱۲۷ تا ۱۲۸)

فصل

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں

”قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي“

امام بھصاؒ نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ سائل کے ہر سوال اور اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھ کر جواب دینا چاہئے جو جواب مخاطب کی فہم سے بالاتر ہو یا اس کے غلط فہمی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہئے۔

اسی طرح بے ضرورت یا لایعنی سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہئے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس کے متعلق اس کو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی اور عالم کو اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ (بھصاؒ)

امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں اس مسئلہ کا ایک مستقل ترجمۃ الباب رکھ کر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اس کا جواب نہیں دینا چاہئے۔ (معارف القرآن بنی اسرائیل ۵/۵۱۶)

غیر ضروری تحقیقات اور اختلافی مسائل میں

طویل بحثوں سے اجتناب

فَلَا تَمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءَ ظَاهِرٍ وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا.

(کھف پ: ۱۵)

یعنی آپ اصحاب کھف کی تعداد وغیرہ کے متعلق ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں

الامتؒ سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع فرو گذاشت نہ فرماتے تھے۔ (ایضاً: ۱۷۱)

حضرت والد صاحب حضرت حکیم الامتؒ تھانویؒ کی یہ گرانقدر نصیحت بار بار سنایا کرتے تھے کہ جب تک تمہارے ضابطہ کے بڑے موجود ہوں ان سے استصواب کئے (یعنی ان سے رائے و مشورہ لیے) بغیر کبھی کوئی اہم کام نہ کرو اور جب ضابطہ کے بڑے نہ رہیں تو اپنے معاصرین اور برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، چنانچہ ساری عمر والد صاحب کا عمل اسی کے مطابق رہا۔

یہ معمول دوسرے معاملات میں تو تھا ہی لیکن کسی نئے فقہی مسئلہ کی تحقیق کرنی ہو تو اس میں اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم اور جواہر الفقہ میں مختلف فقہی مسائل پر جو فقہی رسالے موجود ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کے آخر میں اس زمانہ کے معروف اہل فتویٰ اور اہل علم کی تصدیقات ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ (البلاغ ص: ۴۰۹)

اختلاف کے باوجود ادب و احترام

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو اللہ جل شانہ نے بڑا وسیع القلب اور وسیع النظر بنایا تھا، آپ اپنی تحقیق کے ساتھ دوسرے اکابرین اور معاصر علماء کی تحقیق کو نقل کرنا اپنی سعادت سمجھتے اور انہیں اسی طرح شائع بھی فرمادیا کرتے تھے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے جواہر الفقہ)۔

نیز حضرت والا بعض علماء سے فقہی اختلاف کے باوجود ان کی کتب و فتاویٰ کے حوالے اپنے فتاویٰ کی تائید میں پیش فرمایا کرتے تھے۔ (البلاغ ص: ۷۲۷)

مولانا لکھنوی سے شدید اختلاف کے باوجود آپ اپنے فتاویٰ کی تائید میں ان کے اقوال اور ان کی تصانیف کی عبارتیں پیش فرماتے ہیں اور مولانا لکھنوی کے لیے فرماتے ہیں کہ: کذا قال مولانا المحقق عبدالحی لکھنوی فی مجموعۃ الفتاویٰ۔ (البلاغ ص: ۷۳۱)

اور ایمان نہ لانے کا بیہودہ بہانے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا، ایسے سوالات کے جوابات میں انسان کو فطرتاً غصہ آتا ہے اور جواب بھی اسی انداز سے دیتا ہے مگر ان آیات میں ان کے بیہودہ سوالات کا جو جواب حق تعالیٰ نے اپنے رسول کو تلقین فرمایا وہ قابل نظر اور مصلحین امت کے لیے ہمیشہ یاد رکھنے اور لائحہ عمل بنانے کی چیز ہے کہ ان سب کے جواب میں نہ ان کی بیوقوفی کا اظہار کیا گیا نہ ان کی معاندانہ شرارت کا، نہ ان پر کوئی فقرہ کسا گیا بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص خدا کا رسول ہو کر آئے وہ سارے خدا کے اختیارات کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہو یہ تخیل غلط ہے، رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

(معارف القرآن سورہ کہف ۵/۵۲۰، بنی اسرائیل)

تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ

قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا نَالِحٍ

قرآن نے اس جگہ تقلید آبائی کے خوگر لوگوں کی غلطی کو واضح فرمایا اور اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک خاص مؤثر طریقہ بھی بتلادیا جس سے مخاطب کی دل آزاری یا اس کو اشتعال نہ ہو، کیونکہ دین آبائی کی تقلید کرنے والوں کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ کیا تمہارے باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے جب کہ باپ دادا نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل۔

(معارف القرآن سورہ توبہ ۲/۳۲۵)

کاوش نہ کریں بلکہ سرسری بحث فرمادیں اور ان لوگوں سے آپ خود بھی کوئی سوال اس کے متعلق نہ کریں کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وحی میں آگئی، غیر ضروری سوالات اور تحقیقات شانِ انبیاء کے خلاف ہے۔

ان دونوں جملوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی وہ درحقیقت علماء امت کے لیے اہم رہنما اصول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں مزید بحث و تکرار میں وقت کی ضاعت ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت دوسرے جملہ میں یہ دی گئی ہے کہ اصحاب کہف کی زائد تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے یا ان کو رسوا کرنے کے لیے سوال کیا جائے یہ بھی اخلاق انبیاء کے خلاف ہے اس لیے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا یعنی تحقیق مزید کے لیے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لیے ہو۔

(معارف القرآن سورہ کہف ۵/۵۶۸)

بے ہودہ سوالوں کے جواب میں حلم و صبر کی ضرورت

آیات مذکورہ (لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا - بنی اسرائیل پ ۱۵) میں جو سوالات اور فرمائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایمان لانے کی شرط قرار دے کر کی گئیں وہ سب ایسی ہیں کہ ہر انسان ان کو سن کر ایک قسم کا تمسخر

علمی تنقید کی اجازت ہے مگر طعن و تشنیع ممنوع ہے

طَعْنُوا فِي دِينِكُمْ (سورہ توبہ: ۱۰) کے لفظ سے بعض حضرات نے اس پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کے دین پر طعن و تشنیع کرنا عہد شکنی میں داخل ہے۔ جو شخص اسلام اور شریعت اسلام پر طعن زنی کرے اس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہیں رہ سکتا۔ مگر باتفاق فقہاء اس سے مراد وہ طعن و تشنیع ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی اہانت اور تحقیر کے طور پر اعلانیاً کی جائے۔ احکام و مسائل کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا اس سے مستثنیٰ ہے اور لغت میں اس کو طعن و تشنیع کہتے بھی نہیں۔ اس لیے دارالاسلام کے غیر مسلم باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جاسکتی ہے مگر اسلام پر طعن زنی اور تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ (معارف القرآن سورہ توبہ: ۳۲)

ہٹ دھرمی کے وقت الزامی جواب دینا مناسب ہے

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ اِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ. (سورہ صافات: ۲۳)
ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہوں ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے، الزامی جواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود انہی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے، اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ بھی غلط ہوتا ہے لیکن مخالف کو سمجھانے کے لیے اس سے کام لیا جاتا ہے، یہاں باری تعالیٰ نے ان کے عقیدے کی تردید کے لیے خود انہی کے نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود باعث ننگ و عار ہے ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیوں کا وجود باعث ننگ ہے، نہ یہ مطلب کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجائے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا بلکہ یہ الزامی جواب ہے جس کا مقصد خود انہیں کے مزعومات سے ان کے

عقیدے کی تردید کرنا ہے ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی ہے جو قرآن کریم ہی میں کئی جگہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اسے نہ کسی اولاد کی ضرورت ہے اور نہ اس کی رفعت شان کو یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ (معارف القرآن صفت ۷: ۲۸۴)

اگر اپنے اور دوسروں کے فتوؤں میں اختلاف ہو جائے

اگر آپ کے فتویٰ سے کسی عالم کو اختلاف ہوتا تو آپ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرماتے اور بعض مرتبہ اختلاف کا ذکر بھی فرماتے بلکہ ان کی مفصل تحریر اپنے فتوے کے ساتھ منسلک فرما کر شائع کر دیا کرتے تھے۔

اگر حضرت مفتی صاحب کے فتویٰ سے کسی کو اختلاف ہوتا اور وہ آپ کے فتویٰ کے خلاف عمل کرتا تو آپ اس سے بالکل ناگواری کا اظہار نہ فرماتے بلکہ بعض جگہ خود موصوفہً اپنی تحقیق اینق کے بعد تحریر فرما دیا کرتے کہ کسی کو اس سے اختلاف ہو وہ دوسرے علماء سے تحقیق کر کے اس پر عمل کریں۔ (البلاغ ص: ۲۳۷)

اگر حضرت مفتی صاحب کو اپنے فتوے اور اکابرین کے فتاویٰ میں اختلاف ہو جاتا تو اپنے فتوے کو ترجیح دینے کے بجائے لکھ دیتے کہ مسائل کو اختیار ہے جس کے فتوے پر دیانہ اعتماد ہو، اس پر عمل کرے یا مزید تحقیق کر کے جو رائج ہو اس پر عمل کرے۔ (البلاغ ص: ۲۶۷)

سخت اور متعصبانہ الفاظ سے احتراز

آپ کی تصانیف و تحریرات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے مسائل کے اختلاف میں کبھی سخت متعصبانہ الفاظ نہیں استعمال کئے، ذاتیات سے ہمیشہ دامن بچایا اور کبھی ایسا انداز بیان اختیار نہیں فرمایا جس سے دوسرے عالم کی توہین و تذلیل ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اختلافات میں آپ بہت محتاط الفاظ استعمال

فرماتے تھے اور وہ اختلافات صرف مسئلے کی حد تک ہوتے تھے۔ منجی کلام کی نوبت نہیں آتی تھی اور اختلاف رائے پر کبھی غصہ یا ناگواری کا اظہار نہ فرماتے تھے اگرچہ اختلاف کرنے والا آپ کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مولانا عاشق الہی صاحب جو کئی سال تک حضرت کے زیر سایہ فتاویٰ کے جوابات دیتے رہے فرماتے ہیں۔

”احقر کو بہت سی جگہ اختلاف رائے بھی ہوتا، بندہ عرض کر دیتا کہ یہ جواب آپ کی رائے کے مطابق لکھ دیا ہے آپ دستخط فرمادیں، میں دستخط نہیں کروں گا، میری گزارش بشاشت سے قبول فرماتے اور دستخط فرمادیتے؟“

(البلاغ ص: ۷۳۰)

شیخ سے فقہی اختلاف

نیز آپ نے بعض مسائل میں اپنے شیخ و مربی حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے فقہی اختلاف فرمایا ہے جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ سے فقہی اختلاف اپنے نفس کی اصلاح میں مانع نہیں اور شیخ کو بھی مرید کے فقہی اختلاف سے اظہار ناراضگی یا انقباض نہ ہونا چاہئے، بلکہ شیخ کی اپنی غلطی ہو تو اس سے رجوع ہو جانا چاہئے جیسا کہ حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی صاحب کا طرز عمل تھا (جس کی تفصیل جواہر الفقہ میں موجود ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مذاق یہ تھا کہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود طعن و تشنیع اور دل آزار اسلوب بیان سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ (البلاغ ص: ۴۶۸)

مداہنت سے کلی اجتناب

لیکن اس نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ حق کو حق یا باطل کو باطل کہنے میں مداہنت سے

کام لیا جائے کیونکہ کفر کو کفر تو کہنا ہی پڑے گا کیونکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے ضروری اظہار کے بعد محض اپنی نفسانیت کی تسکین کے لیے فقرہ بازیاں نہ کی جائیں، حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ داعی حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہئے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو لیکن اگر اسے کوئی توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے، چنانچہ مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحب حق کے معاملہ میں ادنیٰ لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا جس سے عناد کے بجائے دلسوزی، حق پرستی اور للہیت مترشح ہوتی تھی۔ (البلاغ ص: ۴۶۹)

حق پرستی و انصاف پسندی

علم و تحقیق کے سفر میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں ایک طالب علم کو دوسرے طالب علم سے اختلاف کرنا پڑتا ہے اور بعض مقامات پر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت والد صاحب کا طرز عمل یہ تھا کہ نہ تو کسی کا ادب و احترام اس سے اختلاف رائے کے اظہار میں مانع ہوا اور نہ کبھی اختلاف رائے نے ادب و احترام میں ادنیٰ رخسہ اندازی کی، آپ نے بعض مسائل میں بھی اختلاف کیا بلکہ اپنے شیخ و مربی حکیم الامت حضرت تھانوی سے بھی چند فقہی مسائل میں اختلاف رائے رہا، اور خود حضرت نے آپ سے یہ فرمایا کہ تمہارے دلائل پر مجھے شرح صدر نہیں ہوتا اور میرے دلائل پر تمہیں شرح صدر نہیں، اس لیے دونوں اپنے اپنے موقف پر رہیں تو کچھ حرج نہیں۔ (البلاغ ص: ۴۹۴)

اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی عظمت و عقیدت آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ آپ نے کبھی اس عقیدت کو مسائل کی تحقیق و تنقید میں

دیتے بلکہ ان کے کلام کا کوئی صحیح محمل تلاش کر کے لکھ دیتے۔

مثلاً اوزان شریعہ میں رائج الوقت اوزان کے لحاظ سے ”درہم“ کی مقدار مقرر کرنے میں آپ نے حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی جیسے بڑے محقق عالم سے اختلاف فرمایا لیکن اس کے لیے صرف اپنے دلائل اور حضرت مولانا کے دلائل کی تردید پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جستجو کر کے وہ وجہ بھی بیان فرمادی، جس سے حضرت مولانا کا عذر واضح ہو جاتا ہے۔ (البلاغ ص: ۴۹۶)

طعن و تشنیع و دلائل و اسلوب کا نقصان

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں آغاز شباب میں دوسروں کی تردید کے لیے بڑی شوخ اور چلبلی تحریر لکھنے کا عادی تھا اور تحریری مناظروں میں میرا طرز تحریر طنز و تعریض سے بھرپور ہوتا تھا اور ”ختم نبوت“ میں نے اسی زمانہ میں لکھی تھی لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میرے انداز تحریر کا رخ بدل دیا اور وہ یہ کہ میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب ختم نبوت میں جو دلائل پیش کئے ہیں، بنظر انصاف پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہت مضبوط معلوم ہوتے ہیں اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں مرزا صاحب کی اتباع سے تائب ہو جاؤں لیکن آپ نے اس کتاب میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ مجھے اس اقدام سے روکتا ہے میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ لوگ دلائل پر اکتفا کرتے ہیں، طعن و تشنیع سے کام نہیں لیتے، اس لیے میں اب تک اپنے مذہب پر قائم ہوں اور آپ کے طعن و تشنیع نے دل میں کچھ ضد بھی پیدا کر دی ہے۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ ان صاحب نے یہ بات کہاں تک درست لکھی تھی لیکن اس واقعہ سے مجھے یہ تنبیہ ضرور ہوا کہ طعن و تشنیع کا یہ انداز

حائل نہیں ہونے دیا، اور نہ کبھی اپنی تنقید سے کسی کی عظمت و عقیدت پر حرف آنے دیا، ایسا کرنا مشکل ضرور ہے لیکن اس مشکل کو آپ نے جس خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ اہل علم کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ (البلاغ ص: ۱۷۱-۱۷۲)

اس سلسلہ کی جو خط و کتابت ”مکاتیب حکیم الامت“ میں محفوظ ہے وہ تحقیق و تنقید، بے نفسی اور حق پرستی کا ایسا جیتا جاگتا نمونہ ہے کہ آج کل کی دنیا میں اس کی مثالیں نایاب ہیں۔

آج کل تو دعوؤں اور اظہار برتری کا نام علمی تحقیق رکھ دیا ہے اور حملہ بازی اور دوسرے کی تنقیص و تذلیل کو ”تنقید“ کا مقدس نام دے دیا گیا ہے جو بات ایک مرتبہ زبان سے نکل گئی پھر کی لکیر بن کر وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے لیکن یہ سب باتیں نفسیات کی پیداوار ہیں اور جہاں فریقین کا مقصود ہی حق کی تلاش ہو وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کہنے والا میری رائے کے موافق کہہ رہا ہے یا مخالف، وہاں نظر اس پر رہتی ہے کہ کس دلیل سے کہہ رہا ہے۔

چنانچہ حضرت حکیم الامت کے یہاں جو فتاویٰ کا سلسلہ جاری تھا ان میں آپ نے ایک مستقل ”ترجیح الراجح“ کا باب رکھا تھا۔ اس باب میں وہ فتاویٰ درج کئے جاتے تھے جن سے حضرت نے کسی کی توجہ دلانے سے یا خود ہی تحقیق بدل جانے کے باعث رجوع کر لیا ہو، سلف صالحین، صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا یہی رنگ تھا اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ (البلاغ ص: ۱۷۱)

بڑوں سے اختلاف رائے کا طریقہ

ایسے مواقع پر حضرت والد صاحب کا عام معمول یہ تھا کہ جن صاحب سے اختلاف رائے ہوا ہے نہ صرف یہ کہ ان کے ادب و احترام میں کوئی ادنیٰ فرق نہ آنے

مفید کم ہے اور مضر زیادہ۔

چنانچہ اس کے بعد میں نے ”ختم نبوت“ پر اس نقطہ نظر سے نظر ثانی کی اور اس میں ایسے حصے حذف کر دیئے جن کا مصرف دلائل زاری کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس کے بعد کی تحریروں میں دلائل زار اسلوب سے مکمل پرہیز شروع کر دیا۔ (البلاغ ص: ۴۶۵)

کسی رسالہ کی تردید یا کسی فرقہ پر تنقید کا طریقہ

دوسرے نظریات کی تردید میں حضرت والد صاحب کا ایک اصول یہ تھا کہ جس شخص یا گروہ پر تنقید کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات و افکار اور اس کے منشا و مراد کی اچھی طرح تحقیق کر لی جائے، اور اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کی جائے جو اس نے نہیں کہی، یا جو اس کی عبارتوں کے منشا و مراد کے خلاف ہو۔

آج کل بحث و مباحثہ و مناظروں کی گرم بازاری میں احتیاط و تثبت کے اس پہلو کی رعایت بہت کم کی جاتی ہے۔ اور دوسرے کی تردید کے جوش میں اس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح بعض ایسی باتیں مخالف کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جو اس نے نہیں کہی ہوتیں۔

یہ طرز عمل اول تو انصاف کے خلاف ہے دوسرے اس سے تردید کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا، بسا اوقات اس کے نتیجہ میں بحث و مباحثہ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو افتراق و انتشار پر منتج ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے احقر کو اس زریں اصول کی تلقین فرمائی تھی کہ یوں تو انسان کو اپنے ہر قول و فعل میں محتاط ہونا چاہئے لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرو، جسے شرعی اصولوں کے مطابق

ثابت کرنے کے لیے کافی مواد موجود نہ ہو۔

حضرت والد ماجد قدس سرہ کی اس نصیحت نے احقر کو جس قدر فائدہ پہنچایا اور اس کے جن بہتر ثمرات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا، انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ خود حضرت والد صاحب کی تحریروں میں احتیاط کا یہ پہلو جس قدر نمایاں ہے اور اس کے پیش نظر آپ کی عبارت میں جو قیود و شرائط ملتی ہیں ان کی مثالیں دینا چاہوں تو ایک پورا مقالہ اس کے لیے چاہئے لیکن ایک واضح مثال پر اکتفاء کرتا ہوں۔

خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ مشرقی صاحب نے ایک زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا ان کے عقائد و نظریات جمہور امت سے بہت سے معاملات میں مختلف تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایماء پر حضرت والد صاحب نے ان کے نظریات کی تردید میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جو مشرقی اور اسلام کے نام سے شائع ہوا ہے، رسالہ تو مختصر سا ہے لیکن حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس کی ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی، اول تو مشرقی صاحب کی تمام تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کیا پھر ان کے جن مقامات پر جمہور امت سے ناقابل برداشت انحراف نظر آیا ان کو قلم بند کیا اور پھر مزید احتیاط یہ کی کہ ان کی عبارتوں کو جمع کر کے مشرقی صاحب کے پاس بھیجا کہ ان عبارتوں سے آپ کی مراد وہی ہے جو ان سے ظاہر ہوتی ہے یا آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں، ان کی طرف سے کوئی واضح جواب نہ آیا تو انھیں دوبارہ خط لکھا اور یہ خط و کتابت کافی عرصہ تک جاری رہی، یہاں تک کہ اس خط و کتابت کے نتیجہ میں یقین ہو گیا کہ مراد وہی ہے جو ان کی عبارتوں سے ظاہر ہے تو پھر اس پر تردید تحریر فرمائی، یہ رسالہ جو اہر الفقہ میں شامل ہے۔

(البلاغ ص: ۴۷۰)

کسی فرد یا جماعت سے متعلق رائے قائم کرنے کے سلسلہ میں پوری تحقیق کے بعد بھی خوف خداوندی کا استحضار

”جماعت اسلامی“ سے متعلق سوال کا جواب تحریر فرمانے کے بعد اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ میری ذاتی رائے ہے جو اپنی حد تک غور و فکر کے بعد فیما بینی و بین اللہ قائم کی ہے، میں کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی اور بے احتیاطی سے بھی اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، اور دین کے معاملہ میں مدافعت سے بھی، جن حضرات کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ اپنے عمل کے مختار ہیں، مجھے ان سے کوئی مباحثہ کرنا نہیں اور نہ میرے قویٰ اور مصروفیات اس کے متحمل ہیں، اور کوئی صاحب اس کو شائع کرنا چاہیں تو ان سے میری درخواست ہے کہ اس کو پورا شائع کریں، ادھر اور یا کوئی ٹکڑا شائع کر کے خیانت کے مرتکب نہ ہوں، واللہ المستعان وعلیہ التکلیف۔

(جواہر الفقہ ج ۱ ص ۱۷۲، ۱۷۳)

جدید مسائل کو حل کرنے میں دوسرے علماء سے استصواب واستفسار اور ان کی تحقیقات و آراء سے استفادہ

آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کو نماز میں استعمال کرنے کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک تحقیقی فتویٰ اور مستقل رسالہ تحریر فرمایا تھا، اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

احقر نے ان نئی تحقیقات اور دوسری وجوہ فقہیہ کے ساتھ اپنے رسالہ کو دوبارہ

ترتیب دیا اور اس کا مسودہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، خیر المدارس ملتان وغیرہ اہم مدارس اسلامیہ میں حضرات علماء کے غور و فکر اور استصواب رائے کے لئے بھیج دیا، ان سب حضرات نے جزوی اختلافات کے ساتھ اصل مسئلہ عدم فساد نماز میں اتفاق ظاہر فرمایا تو بنام خدا تعالیٰ یہ رسالہ ۱۳۷۲ھ میں شائع کر دیا گیا۔

مزید احتیاط کے لئے احقر نے اپنی تحریر اور مولانا موصوف کی تمام تنقیدات اپنے دارالعلوم کراچی کے ایک ماہر فن محقق مدرس مولانا مفتی رشید احمد صاحب کے سپرد کر دی کہ سب پر غور کر کے مجھے رائے دیں۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۷۷، ۸۰) انشورنش (بیمہ زندگی) کے متعلق پوری تحقیق کے ساتھ تفصیلی جواب تحریر فرمایا اور ساتھ میں یہ بھی تحریر فرمایا:

”میرا جواب کوئی آخری فیصلہ نہیں، دوسرے علماء کے سامنے پیش ہو کر اس کی اصلاح بھی ہو سکے گی۔“

(جواہر الفقہ ص ۱۸۱ ج ۲)

جدید مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لئے صاحب معاملہ اور ماہرین فن سے تحقیق کرنا

مذکورہ مسئلہ کے سلسلہ میں ماہرین فن سے تحقیق کی غرض سے حضرت مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا:

سوال: بعض مسائل شرعیہ کی تحقیق کے لئے یہ معلوم کرنا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جو آواز دور تک پہنچتی ہے یہ بعینہ بولنے والے کی آواز ہوتی ہے، یا اس کا عکس و شبیہ ہوتی ہے، جیسے آواز بازگشت میں ہوتا ہے، یا جیسے گراموفون کی آواز ہے، سوال کا

ہے کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو تو کم از کم ان کے مساوی تو ہو، اور آج اس مساوات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، البتہ ساتھ ہی حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ایک انتظامی فتویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے وزنی دلائل موجود ہیں، لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے اختیار کر لے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کر لے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباع خداوندی کے بجائے اتباع نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔

(البلاغ ص: ۴۱۹)

منشاء یہ ہے کہ آواز جو ہوا میں پیدا شدہ لہروں یا تموّج کا نام ہے لاؤڈ اسپیکر کسی منزل میں ان کو بدل کر ان کے مشابہ نئی لہریں پیدا کر دیتا ہے، یا انہیں لہروں میں کوئی جدید برقی قوت پیدا کر دیتا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ لہریں منتشر ہونے سے پہلے دور تک پہنچ جاتی ہے، براہ کرم اس مسئلہ میں اپنی تحقیق سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔

(آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام ص: ۹۷)

جدید مسائل کا محاکمہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا آپ جدید مسائل کا قرآن و حدیث اور جمہور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں محاکمہ فرماتے اور اس شرعی محاکمہ سے قبل موصوف جدید مسائل کی ان کے ماہرین سے پوری تحقیق بڑی کدو کاوش کے ساتھ فرماتے، اور جب تک ماہرین کی تحقیقات پر اطمینان نہ ہو جاتا فتویٰ صادر نہ فرماتے بلکہ مزید تحقیقات فرماتے، چنانچہ آپ مشینی ذبیحہ کے متعلق فرماتے ہیں جب تک ان مشینوں کی صحیح صورت حال معلوم نہ ہو کوئی جواب دینا بے کار ہے۔

آگے موصوف رقم طراز ہیں ان حالات میں کسی مفروضہ صورت پر بحث فضول ہے جب تک کہ درآمد کی ہوئی مشین کی صحیح صورت حال معلوم نہ ہو، کوئی فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ (بحوالہ جواہر الفقہ، البلاغ ص: ۷۵۷)

تقلید شخصی شرعی حکم نہیں لیکن انتظامی اور واجبی امر ہے

حضرت والد صاحبؒ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلید شخصی کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس دور ہوا و ہوس میں اسی کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے اور جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکمہ کا سوال آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں

تسہیل امت کی بین دلیل ہے۔

اسی طرح آپ نے حج بدل کرنے والے کے لیے ملا علی قاریؒ اور حضرت گنگوہی کے خلاف تمتع کرنے کی گنجائش دی ہے۔ (البلاغ ص: ۷۶۷)

نیز حج بدل کے ایک اور مسئلہ میں جس میں علماء کا اختلاف ہے آپ نے اس میں سے اہون واسہل کو اختیار فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو جواہر الفقہ)۔ (البلاغ ص: ۷۶۸)

سہولت کی وجہ سے دوسرے مذاہب پر فتویٰ دینے کی

ضرورت اور اس کے حدود و شرائط

چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لیے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ قدس سرہ نے حضرت تھانویؒ کو یہ وصیت کی تھی اور حضرت تھانویؒ نے ہم سے فرمایا کہ آج کل معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کا شکار ہیں اس لیے خاص طور سے بیع و شراء اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلوی عام ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذہب میں عام لوگوں کے لیے گنجائش کا پہلو ہو اس کو فتویٰ کے لیے اختیار کر لیا جائے۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لیے چند باتوں کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔

۱: سب سے پہلے تو یہ کہ واقعہ مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر لیا جائے، اور حضرت والد صاحبؒ کے نزدیک اس اطمینان کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک مفتی خود رائی کے ساتھ یہ فیصلہ نہ

فصل

فتاویٰ میں امت کی سہولت کا خیال

دوسروں کے لیے تسہیل کا یہ عالم ہے کہ اگر مسئلہ میں جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو آپ امت کی سہولت کی خاطر اصل مسئلہ کا جواب لکھنے کے بعد اس کا کوئی حیلہ جواز تحریر فرمادیتے تاکہ لوگ تنگی و پریشانی میں مبتلا نہ ہوں اسی نوعیت کے ایک سوال کے جواب میں جوہبہ مشاع سے متعلق ہے۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

قال فی الدر المختار ولذا يشترط فيه (ای فی عوض الهبة؟

شرائط الهبة كقبض وافرار وعدم شيوع)۔ (شامی ص: ۷۸۹، ج ۲/۲۹۲)

عبارات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہبہ بالعوض میں بھی شیوع مانع ہے لہذا صورت ہبہ مندرجہ سوال جائز نہیں، البتہ ایک حیلہ سے جائز ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جائداد مشترکہ موہوب لہما کے ہاتھ فروخت کر دی جائے اور جب بیع تام ہو جائے تو پھر ان کو اس کی قیمت سے بری کر دیا جائے۔ کذا ذکرہ الشامی فی کتاب الهبة۔

مواقیت احرام کے سلسلہ میں ہندو پاکستان سے جانے والے بحری جہاز میں حج کے لیے علماء عصر نے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجب دم قرار دیا ہے اس کے برخلاف حضرت مفتی صاحبؒ نے بحری مسافروں کے لیے اس کو ترجیح دی کہ جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا اور جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے اور نہ اس سے دم لازم آتا ہے جو

ہے ان میں قرآن و سنت ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زریں ہدایت نامہ دیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کا حکم قرآن و سنت میں مذکور نہیں تو اس میں ہمارے لیے کیا ارشاد ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شاو روا الفقهاء العابدین ولا تمضوا فیہ رأياً خاصة

(رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح کذا فی

مجمع الزوائد للہیثمی ۱/۱۷۸)۔

اس حدیث کے مقتضیات پر عمل کرتے ہوئے مختلف زمانوں میں علماء امت کا طریقہ رہا ہے کہ وہ نئے پیش آنے والے احکام دینیہ خصوصاً اجتماعی نوعیت کے مسائل میں باہمی غور و فکر مشورہ اور بحث و تمحیص کے بعد کوئی فتویٰ دیتے تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا عمل بھی اسی پر تھا، فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے انہوں نے ماہر فقہاء عابدین کی جو مجلس بنائی ہوئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا، مغلیہ حکومت کے دور میں فتاویٰ عالم گیری جیسی عظیم الشان کتاب بھی اسی طرح مرتب ہوئی، آخردور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا طریقہ کار بھی یہ تھا کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں بالخصوص ان مسائل میں جو عالمگیر اور اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں محض اپنی انفرادی رائے پر اعتماد فرمانے کے بجائے وقت کے ماہر فقہاء عابدین سے مشورہ فرماتے تھے اور موافق و مخالف تمام پہلو سامنے آنے کے بعد کوئی فتویٰ دیتے تھے۔

نئے فقہی مسائل کی تحقیقات کے لیے آپ نے ”حوادث الفتاویٰ“ کے نام سے ایک مستقل سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور ان میں سے بیشتر مسائل میں آپ کا طریقہ کار یہی تھا، عورتوں کے مسائل و مشکلات کو دور کرنے کے لیے ”الحلیۃ الناجزۃ“ بھی اسی

کرے بلکہ دوسرے اہل فتویٰ حضرات سے مشورہ کرے اگر وہ بھی متفق ہوں تو اتفاق رائے کے ساتھ ایسا فتویٰ دیا جائے۔

۲: دوسری بات یہ ہے کہ جس امام کا قول اختیار کیا جائے اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتویٰ علماء سے معلوم کی جائیں محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفاء نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اور ان کے نظر انداز کر دینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

۳: تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا، اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔

(البلاغ ص: ۴۱۹)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے ”عقد الجید“ میں ائمہ اربعہ سے باہر جانے کے مفاسد تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ مصیبت زدہ خواتین کے لیے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مالکی مذہب پر فتویٰ دینے کا ارادہ کیا، تو ان تمام باتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ مد نظر رکھا اور براہ راست مالکی علماء سے خط و کتابت کے ذریعہ مذہب کی تفصیلات معلوم کیں، اور تمام علماء ہند سے استصواب کے بعد فتویٰ شائع فرمایا۔ (یہ رسالہ ”الحلیۃ الناجزۃ“ کے نام سے شائع ہوا ہے)۔ (البلاغ ص: ۴۱۹-۴۲۰)

فقہی مسائل میں اجتماعی غور و فکر کی ضرورت

حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ فقہی مسائل میں اجتماعی غور و فکر کا سلسلہ قرون اولیٰ سے چلا آتا ہے جن مسائل میں قرآن و سنت کے اندر کوئی نص صریح نہیں

طرح تصنیف ہوئی جو حضرت تھانوی کے تفقہ اور دینی بصیرت کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں ”مجلس فقہی مشاورت“ کی شدید ضرورت

یوں تو زندگی ہر دم رواں پیہم دواں ہے اور ہر نیا زمانہ اپنے ساتھ نئے مسائل اور نئے حالات لے کر آتا ہے لیکن خاص طور سے مشین کے ایجادات کے بعد سے حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، اس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور ہر علم و فن میں نئے مسائل پیدا کر کے تحقیق و تفتیش کے نئے میدان کھولے ہیں، اسی ضمن میں ایسے بے شمار فقہی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا صریح حکم قرآن و سنت یا فقہاء امت کے کلام میں موجود نہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے فقہ اور اصول فقہ کی روشنی میں تحقیق و نظر کی ضرورت ہے اسی وجہ سے ”شاو روا الفقہاء العابدین“ کے ارشاد حدیث پر عمل کرنے کی ضرورت شاید پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے ضرورت تو اس بات کی تھی کہ عالم اسلام کے چیدہ چیدہ فقہاء عابدین جن کی فقہی بصیرت، علم و عمل، تدین و تقویٰ اور معاملہ فہمی پر پوری امت اسلامیہ کو اعتماد ہو مشترکہ طور سے ان مسائل پر غور و فکر کریں، لیکن آج پورا عالم اسلام جن سیاسی اور معاشرتی الجھنوں میں گرفتار ہے ان کے پیش نظر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی، بحالت موجودہ علماء کے ہاتھ میں اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ وہ ایک ہی ملک کے فقہاء عابدین کو جمع کر کے انجام دے سکیں۔

لیکن ”مَالَا يُدْرِكُ كَلْمُهُ لَا يُتْرَكُ كَلْمُهُ“ کے پیش نظر صرف کراچی کے علماء نے اس کام کے لیے ایک غیر رسمی جماعت بنائی ہوئی ہے جس میں کراچی کے ممتاز دینی درس گاہوں کے ماہر اہل فتویٰ شریک ہیں، یہ جماعت نہایت سادگی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہی ہے (مختلف) اداروں کے اہل علم و فتویٰ وقفاً و فائلاً کر بیٹھتے ہیں، نئے مسائل

پر غور و فکر اور بحث و تمحیص کرتے ہیں، مسئلہ کے تمام گوشوں کا غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ ہوتا ہے اور ہر شخص خوب کھل کر اپنی رائے پیش کرتا ہے اور جب کوئی مسئلہ طے ہو جاتا ہے تو اس کو دلائل کے ساتھ لکھ لیا جاتا ہے۔ (البلاغ ص: ۷۰-۷۱)

تفرد سے اجتناب اور مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام

تفرد (یعنی دوسرے علماء سے ہٹ کر کوئی ذاتی موقف اختیار کرنے) سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء کرام نے محقق ابن ہمام اور شاہ ولی اللہ صاحب جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ تو ان کے مقابلہ میں بہت اہون ہے، چنانچہ اگر کبھی آپ کا ذہن کسی ایسی رائے کی طرف مائل ہو جاتا جو معروف نقطہ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں سے کسی کا قول اس کے موافق مل جائے یا معاصر علماء اس رائے پر مطمئن ہو جائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اس وقت تک آپ عموماً اس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔ اس احتیاط کی ایک واضح مثال ”الحلیۃ الناجزۃ“ ہے (جس میں) آپ نے یہ گوارہ نہیں فرمایا کہ محض اپنی رائے سے اس وضاحت کے مطابق فتویٰ دے دیں بلکہ پہلے اس وقت کے اہل فتویٰ حضرات سے استصواب کیا اور اس کے بعد اپنی رائے ظاہر فرمائی۔

آخری سالوں میں تو آپ نے شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ اس غرض کے لیے کراچی کے اہل علم کی ایک باقاعدہ مجلس قائم فرمادی تھی جس کا نام ”مجلس تحقیق مسائل حاضرہ“ تھا اور اس کا کام ہی یہی تھا کہ وہ نوپیش آمدہ مسائل کی اجتماعی طور پر تحقیق کرے اس مجلس کا اجلاس عموماً ہر مہینہ ایک مرتبہ ہوتا تھا۔

(البلاغ ص: ۴۰۹)

فصل

مقتدا و پیشوا کے لیے ضروری ہدایات

فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَقُولْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا۔ (پ ۵۴)

جب منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیا اور جب واپس جاتے تو آپ کی نافرمانی کرنے کے لیے مشورے کرتے اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی کہ ان کی پرواہ نہ کیجئے آپ اپنا کام اللہ کے بھروسے پر کرتے رہیں کیونکہ وہ آپ کے لیے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو، اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے لوگ طرح طرح کے اٹھے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہئے، اگر اس کا رخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور کامیاب ہوگا۔

(معارف القرآن ۲/۲۸۸)

منکرات پر نکیر کا طریقہ

اور اہل علم و ارباب افتاء کے لیے اہم ہدایت

حضرت والد صاحب کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عالم یا دینی مقتدا کے حلقہ میں آپ کا جانا ہوتا اور وہاں کے عوام میں آپ کوئی ایسی عام غلطی دیکھتے جو اس عالم یا

مقتدا کے علم میں رہی ہے تو اس غلطی پر خود عوام کو نہیں ٹوکتے تھے بلکہ اس عالم یا مقتدا کو تنہائی میں متوجہ فرمادیتے تھے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف سے مسئلہ بتا کر ان کے عمل کی اصلاح کر دیں اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ اگر میں براہ راست لوگوں کو مسئلہ بتا دوں تو لوگ شاید میرے علم و فضل کے تو قائل ہو جائیں لیکن جن عالم یا دینی رہنما سے ان کا دن رات سابقہ ہے اس طرف سے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوگی کہ اتنے دن سے ان صاحب کے ساتھ رہتے ہیں مگر انہوں نے ہمیں کبھی اس غلطی پر متوجہ نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے انہیں دینی فائدہ پہنچ رہا تھا اس پر اعتماد میں کمی آجائے گی جو ان کے دین کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ تو اس حد تک احتیاط فرماتے تھے کہ جب کبھی دوسرے شہر میں جانا ہوتا اور کوئی شخص مسئلہ پوچھنے کے لیے آتا تو آپ عام طور پر خود بتانے کے بجائے اس شہر کے مفتی کا پتہ بتاتے کہ ان سے جا کر معلوم کرو، اور اپنے رفقاء سے فرماتے کہ اگر میں اس شخص کو مسئلہ بتا دوں اور مقامی علماء یا مفتی حضرات کے بتائے ہوئے مسئلے سے کچھ فرق ہو جائے تو میں توکل یہاں سے چلا جاؤں گا اور یہ لوگ مقامی علماء سے بدگمان ہو کر آئندہ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے وقت جھک محسوس کریں گے۔ (البلاغ ص: ۴۹۵-۴۹۶)

تھوڑا سا وقت خلوت اور ذکر و شغل کے لیے بھی نکالنا چاہئے

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ (پ ۳۰ سورۃ انشراح)

یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو دوسری محنت کے لیے تیار ہو جائیں وہ یہ کہ نماز اور ذکر اللہ، دعا و استغفار میں لگ جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرنے والے ہیں

بقدر ضرورت مستثنیٰ ہے، اس کی شہادت بھی بہت سے حضرات علماء وفقہاء کے عمل سے ثابت ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۵۹۲، ۵۹۳ سورۃ منزل)

اتَّقُوا مَوَاضِعَ التَّهَمِّ

تہمت و بدنامی کے موقعوں سے بچنا بھی ضروری ہے

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، ایک رات میں ام المؤمنین حضرت صفیہ آپ کی زیارت کے لئے مسجد میں گئیں واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہوئے، گلی میں دو انصاری صحابی سامنے آگئے تو آپ نے آواز دے کر فرمایا، ٹھہرو میرے ساتھ صفیہ بنت حبیٰ ہیں، ان دونوں نے بکمال ادب عرض کیا سبحان اللہ یا رسول اللہ! (یعنی کیا آپ نے ہمارے بارے میں یہ خیال کیا کہ ہم کوئی بدگمانی کریں گے؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک کیونکہ شیطان انسان کے خون کے ساتھ اس کی رگ و پے میں اثر انداز ہوتا ہے، مجھے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دلوں میں کوئی وسوسہ بدگمانی کا پیدا نہ کرے (اس لئے میں نے بتلادیا کہ کوئی غیر عورت میرے ساتھ نہیں)۔

فائدہ: جیسا کہ خود برے کاموں سے بچنا انسان کے لئے ضروری ہے اسی طرح مسلمانوں کو اپنے بارے میں بدگمانی کا موقع دینا بھی درست نہیں، ایسے مواقع سے بچنا چاہئے جس سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہو اور کوئی ایسا موقع آجائے تو بات واضح کر کے تہمت کے مواقع کو ختم کر دینا چاہئے، خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث نے شیطانی وسوسہ کا بڑا خطرناک ہونا ثابت کیا ہے جس سے بچنا آسان نہیں بجز خدا کی پناہ کے۔

تنبیہ: یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان باختیار خود مشغول ہو، اور غیر اختیاری وسوسہ و خیال جو دل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ

ان کو اس سے غفلت نہ ہونی چاہئے کہ ان کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہئے جیسا کہ علماء سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں، اس کے بغیر تعلیم و تبلیغ بھی مؤثر نہیں ہوتی ان میں نور و برکت نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۷۷۸)

اہل علم و ارباب افتاء و مقتدا حضرات کو بھی ذکر و عبادت کا

خاص اہتمام کرنا چاہئے

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا. (سورہ مزمل پ ۲۹)

لفظ سح کے لفظی معنی جاری ہونے اور گھومنے پھرنے کے ہیں اسی سے پانی میں تیرنے کو بھی سح اور سباحت کہا جاتا ہے کہ پانی میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھومنا پھرنا تیرا کی کے ساتھ آسان ہے، یہاں مراد سح سے دن بھر کے مشاغل ہیں جن میں تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق کے لئے یا اپنی معاشی مصالح کے لئے چلنا پھرنا سب داخل ہیں۔

اس آیت میں قیام اللیل کے حکم کی تیسری حکمت و مصلحت کا بیان ہے، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کے لئے عام ہے وہ یہ کہ دن میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دوسرے سبھی حضرات کو بہت سے مشاغل چلنے پھرنے کے رہتے ہیں، فراغ بالی سے عبادت میں توجہ مشکل ہوتی ہے، رات کا وقت اس کام کے لئے رہنا چاہئے کہ بقدر ضرورت نیند اور آرام بھی ہو جائے اور قیام اللیل کی عبادت بھی۔

فائدہ: حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء و مشائخ جو تعلیم و تربیت اور اصلاح خلق کی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں ان کو بھی چاہئے کہ یہ کام دن ہی تک محدود رہنے چاہئیں، رات کا وقت اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری اور عبادت کے لئے فارغ رکھنا بہتر ہے جیسا کہ علمائے سلف کا تعامل اس پر شاہد ہے، کوئی وقتی ضرورت دینی تعلیمی، تبلیغی کبھی اتفاقاً رات کو بھی اس میں مشغول رکھنے کی داعی ہو تو وہ

مضر نہیں، نہ اس پر کوئی گناہ ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۸۵۳ سورہ ناس)

مسلمانوں کو غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام بھی ضروری ہے

اسی واقعہ نے ہمیں ایک سبق یہ دیا کہ جو کام فی نفسہ جائز و درست ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو خود غلط فہمی پیدا ہوگی، یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے گا تو یہ کام نہ کیا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین ابن ابی کانفک کھل جانے کے بعد بھی فاروق اعظمؓ کے اس مشورہ کو قبول نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کیا جائے، کیونکہ اس میں خطرہ یہ تھا کہ دشمنوں کو عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

مگر دوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ غلط فہمی کے خطرہ سے ایسے کاموں کو چھوڑا جاسکتا ہے جو مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہوں گو مستحب اور کار ثواب ہوں، کسی مقصد شرعی کو ایسے خطرہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا بلکہ خطرہ کے ازالہ کی فکر کی جائے گی اور اس کام کو کیا جائے گا۔ (معارف القرآن سورہ منافقون ص ۴۵۶ ج ۸)

لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنا اسی وقت تک محمود ہے جب تک کسی مقصود شرعی پر اثر انداز نہ ہو

اس معاملہ میں اصل ضابطہ جو قرآن و سنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کے نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور

کوئی دینی حکم حلال و حرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہ محمود ہو۔

اس کی نظیر حدیث و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمی کے خلاف کر دی گئی ہیں، اول تو یہ کہ بیت اللہ کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر چھوڑ دیا، دوسرے بناء ابراہیمی میں لوگوں کے بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے تھے، ایک مشرقی جانب میں دوسرا مغربی جانب میں جس کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے میں زحمت نہ ہوتی تھی، اہل جاہلیت نے اس میں دو تصرف کئے کہ مغربی دروازہ تو بالکل بند کر دیا اور مشرقی دروازہ جو سطح زمین سے متصل تھا اس کو اتنا اونچا کر دیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ نہ ہو سکے، جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ جس کو اجازت دیں صرف وہ اندر جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نو مسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دیتا، یہ حدیث سب کتب معتبرہ میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا اس کو ترک کر دیا، اور منجانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عند اللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہو گیا، مگر یہ معاملہ بیت اللہ کو بناء ابراہیمی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا ایسا نہیں جس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو یا جس سے احکام حلال و حرام متعلق ہوں۔

بخلاف واقعہ نکاح زینبؓ کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو، حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے

فصل

آداب المستفتی

احکام سے ناواقف عوام الناس پر علماء و مفتیوں سے مسئلہ معلوم کر کے عمل کرنا اور ان کی تقلید کرنا واجب ہے

فَسَلُّوا أَهْلَ الدِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ (سورہ نحل)

(اگر تم کو علم نہیں ہے تو دوسرے اہل علم سے پوچھو) یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی، امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل کریں۔ (معارف القرآن ج ۵ ص ۳۳۳ سورہ نحل پ ۱۲)

(مسئلہ) تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت (فَسَلُّوا أَهْلَ الدِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ) سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جس کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں اس پر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔

(معارف القرآن سورہ انبیاء پ ۷ ج ۶ ص ۱۵۹)

متعلق ہوا تھا، اس تقریر سے بناء بیت اللہ کے ترک اور نکاح زینبؓ پر بارشاد خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہو گیا۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی قوی تبلیغ جو سورہ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے اس کو کافی سمجھا، اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم و ارادہ کے اس کو چھپایا، اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور اس کا اظہار فرمایا لکیلا یكون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیائهم اذا قضوا منهن وطرا، یعنی ہم نے زینبؓ سے آپ کا نکاح اس لئے کیا تا کہ مسلمانوں پر اس معاملے میں کوئی عملی تنگی پیش نہ آئے کہ منہ بولے بیٹوں کی مطاقہ بیویوں سے نکاح کر سکیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف طعنہ زنی کا ایک ایسے کام میں پیش آیا جو بظاہر ایک دنیوی کام تھا، تبلیغ و رسالت سے اس کا تعلق نہ تھا، پھر جب آیات مذکورہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ نکاح بھی عملی تبلیغ و رسالت کا ایک جزء ہے تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی کا خوف طعن و تشنیع مانع عمل نہیں ہوا، اور یہ نکاح عمل میں لایا گیا، اگرچہ بہت سے کفار نے اعتراضات کئے اور آج تک کرتے رہتے ہیں۔ (معارف القرآن سورہ احزاب ص ۱۵۵ ج ۷)

دلائل کی حاجت نہیں

اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو ہے نہیں اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ (معارف القرآن ج ۵ ص ۳۳۳ سورہ نحل پ ۱۲)

بلا ضرورت سوال کرنے کی ممانعت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءٍ إِنْ تُبَدَّ لَكُمْ تَسْأَلُكُمْ۔ (مائدہ پ ۷)

ان آیات میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو احکام الہیہ میں بلا ضرورت تدقیق اور بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے اور جو احکام تمہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر کسی داعیہ ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کیا کریں جن کے نتیجہ میں ان پر کوئی مشقت پڑ جائے یا ان کو خفیہ رازوں کے اظہار سے رسوائی ہو۔ (معارف القرآن، مائدہ ص: ۲۴۵ جلد ۳)

فتویٰ لینے اور مسئلہ پوچھنے سے پہلے مستفتی کی ذمہ داری

سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ۔ (مائدہ پ ۶)

اس میں مسلمانوں کے لیے ایک اہم اصولی ہدایت یہ ہے کہ اگرچہ جاہل عوام کے لیے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتوے اور تعلیم پر عمل کریں لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کر لیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے

سے پہلے کیا کرتا ہے کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس مرض کے لیے کون سا ڈاکٹر ماہر ہے، کون سا حکیم اچھا ہے اس کی ڈگریاں کیا کیا ہیں؟ اپنی مقامی تحقیق کے بعد بھی اگر وہ کسی غلط ڈاکٹر یا حکیم کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کردی تو عقلاء کے نزدیک وہ قابل ملامت نہیں ہوتا لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی کے جال میں جا پھنسا اور پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ عقلاء کے نزدیک خود اپنی خودکشی کا ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لیے دینی امور کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے اہل علم و فن اور تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدی بنایا اور اس کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ عند الناس بھی معذور سمجھا جائے گا اور عند اللہ بھی۔

ایسے ہی معاملہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فان اثمہ علی من افقی یعنی ایسی صورت میں اگر عالم اور مفتی نے غلطی کر لی اور کسی مسلمان نے ان کے غلط فتوے پر عمل کر لیا تو اس کا گناہ اس پر نہیں بلکہ اس عالم اور مفتی پر ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ اس عالم نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہو، یا امکانی غور و خوض میں کمی کی ہو، یا یہ کہ وہ عالم ہی نہ تھا اور لوگوں کو فریب دے کر اس منصب پر مسلط ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم یا مقتدا قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں تو اس کا وبال تنہا اس مفتی و عالم پر نہیں ہے بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے جس نے تحقیق کئے بغیر اپنے ایمان کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے حوالے کردی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد خداوندی ہے: سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ، یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے مقتداؤں کے علم و عمل اور امانت و دیانت کی تحقیق کئے بغیر ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

(معارف القرآن، سورہ مائدہ ۱۲۹/۳)

اہل علم اور مفتیوں میں اختلاف ہو تو عوام کیا کریں

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتوؤں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہو تو ہم کدھر جائیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جس طرح کسی بیمار کے سلسلہ میں ڈاکٹروں، طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے بس اس کا علاج کرتے ہیں۔

دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر کوشش کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ افضل سمجھیں اس کی اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور در صورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتوؤں میں کسی فتوے کو ترجیح دے، لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے اگر حقیقت کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے۔

(معارف القرآن، سورۃ انعام ۳۶۶)

فصل

قلم و کتابت کی اہمیت

تعلیم کا سب سے پہلا اور اہم ذریعہ قلم اور کتابت ہے

ایک صحیح حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابہ فہو عندہ فوق العرش، ان رحمتی غلبت غضبی، یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں جب مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ کلمہ لکھا کہ ”میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی“۔ اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اول ما خلق اللہ القلم فقال له اکتب فکتب ما یكون الی یوم القیمۃ فہو عندہ فی الذکر فوق عرشہ۔

یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے، اس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں لکھ دیں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے۔ (قرطبی)

قلم کی تین قسمیں

علماء نے فرمایا ہے کہ عالم میں قلم تین ہیں، ایک سب سے پہلا قلم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تقدیر کائنات لکھنے کا اس کو حکم دیا، دوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات اور ان کی مقادیر کو نیز انسانوں کے اعمال کو لکھتے

ذریعہ لکھی گئیں اور رہتی دنیا تک باقی رہیں، اگر قلم نہ ہو تو دنیا و دین کے سارے ہی کام مختل ہو جائیں۔

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ خط و کتابت کا بہت اہتمام کیا ہے
 علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ تعلیم خط و کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علماء و طلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سیکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریر کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں فالی اللہ المشتکیٰ۔

(معارف القرآن پ ۳۰ سورۃ العلق)

خط نویسی کے چند آداب

اِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَاِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایت نہ دی ہوں، خط و کتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت و شنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے، اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سبا (بلقیس) پورا پورا نقل فرمایا گیا، یہ ایک پیغمبر و رسول کا خط ہے، اور قرآن کریم نے اس کو بطور استحسان کے نقل کیا ہے اس لیے اس خط میں جو ہدایات خط و کتابت کے معاملہ میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لیے بھی قابل اتباع ہیں۔

کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا

سب سے پہلے ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا، مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا قرآن کریم کے الفاظ

ہیں، تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد میں کام لیتے ہیں اور کتابت درحقیقت بیان کی ایک قسم ہے اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے۔ (قرطبی)

امام تفسیر مجاہد نے ابو عمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دست قدرت سے خود بنائی اور ان کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا گئے یعنی ہو جا، وہ موجود ہو گئیں، یہ چار چیزیں یہ ہیں قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام۔

علم کتابت سب سے پہلے دنیا میں کس کو دیا گیا؟

بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن کتابت ابولہٰ بشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا تھا اور سب سے پہلے انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ (کعب احبار)
 اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادريس علیہ السلام کو ملا ہے اور سب سے پہلے کاتب دنیا میں وہی ہیں۔ (ضحاک)
 اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے وہ تعلیم منجانب اللہ ہی ہے۔

خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا نہ دنیا کے کاروبار درست ہوتے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور ان کو جہل کی اندھیری سے نور علم کی طرف نکالا اور علم کتابت کی ترغیب دی کیونکہ اس میں بیشمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، تمام علوم و حکم کی تدوین اور اولین و آخرین کی تاریخ ان کے حالات و مقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے

البتہ روح المعانی میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کلام افضلیت میں ہے جواز میں نہیں، اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے اخیر میں لکھ دے تو یہ بھی جائز ہے، فقیہ ابواللیث کی بستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام سے شروع کر دے تو اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ امت میں یہ طریقہ بھی چلا آ رہا ہے اس پر نکیر نہیں کی گئی۔ (روح المعانی و قرطبی)

خط کا جواب دینا بھی سنتِ انبیاء ہے

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اس کے لیے مناسب ہے کہ اس کا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے، اسی لیے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جواب سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے۔ (قرطبی)

خطوط میں بسم اللہ لکھنا

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ خط سے نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنا سنتِ انبیاء ہے، رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس بات پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم اس کے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے، اور قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے اس کے ظاہر سے جواز اس کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے لیکن ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا۔

میں مذکور نہیں، مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لیے سنتِ انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں، مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آ جائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اسی ماحول میں خط کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے، مخاطب کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے کہاں سے آیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں ان سب میں بھی آپ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے (من محمد عبد اللہ و رسولہ) سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے اس میں تو اپنے نام کی تقدیم پر کوئی اشکال نہیں لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، استاد، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے اس میں اپنے نام کو مقدم کرنا کیا اس کے ادب کے خلاف نہ ہوگا، اور اس کو ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟

اس معاملہ میں حضرات صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے، اکثر حضرات نے تو اتباع سنت نبوی کو ادب پر مقدم رکھ کر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط لکھے ان میں بھی اپنے نام کو مقدم رکھا ہے۔ روح المعانی میں بحر محیط کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما كان احد اعظم حرمه من رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان اصحابه اذا كتبوا اليه كتابا بدأوا بآفسهم، قلت! وكتاب علاء الحضرمي يشهد له على ماروى.

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی انسان قابلِ تعظیم نہیں مگر صحابہ کرام جب آپ کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے، اور حضرت علاء حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم، من سليمان بن داود الى بلقيس ابنة
ذی شرح وقومها۔ ان لا تعلوا، الخ۔

بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سنایا تو اس نے قوم کی آگاہی کے لیے سلیمان
علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا، قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے،
قرآن میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ
مقدم تھی، یا سلیمان علیہ السلام کا نام، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا نام
لفافے کے اوپر لکھا ہوا اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سنایا تو
حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔

مسئلہ: خط نویسی کی اصل سنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ
لکھی جائے، لیکن قرآن و سنت کے نصوص و اشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ
قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اس جگہ اس کاغذ کی
بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط
اور ایسی تحریریں بسم اللہ یا اللہ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے
گناہ کا شریک ہو جائے گا، آج کل جو عموماً ایک دوسرے کو خطوط لکھے جاتے ہیں ان کا
حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں اس لیے مناسب
یہ ہے کہ ادائے سنت کے لیے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔

ایسی تحریر جس میں کوئی آیت قرآنی لکھی ہو، کیا

کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے؟

یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اس وقت بھیجا ہے جب کہ وہ
مسلمان نہیں تھیں حالانکہ اس خط میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا، جس سے معلوم ہوا

کہ ایسا کرنا جائز ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوک عجم کو لکھے ہیں اور وہ
مشرک تھے، ان میں بھی بعض آیات قرآنی لکھی ہیں، وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم کا
کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون
کے ضمن میں کوئی آیت آگئی ہے وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اس لیے اس کا حکم بھی
قرآن کا حکم نہیں ہوگا، وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ
میں بھی۔ (عالم گیری کتاب الحظر والاباحۃ)

خط مختصر جامع بلغ اور موثر انداز میں لکھنا چاہئے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس والا نامہ کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم
اور ضروری مضامین بھی جمع کر دیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے، کافر کے مقابلہ
میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا بیان اور
اسلام کی طرف دعوت بھی، اور ترفع و تکبر کی مذمت بھی، درحقیقت یہ خط بھی اعجاز قرآنی
کا ایک نمونہ ہے، حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت
بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہ ہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں۔

(روح المعانی، ماخوذ از معارف القرآن پ ۱۹ سورہ نمل ص ۵۶۶ ج ۶)

تمت

کتاب التعریفات

تعریفات فقہیہ و اصطلاحات شرعیہ

قرآن کی روشنی میں

(افادہ)

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

انتخاب و ترتیب

محمد زید مظاہری، ندوی

استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگا ہر دوئی روڈ لکھنؤ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پر مشتمل

مرتب کی چندا ہم کتابیں ہیں

(۱) دین و شریعت کی بنیادیں اور فقہی اصول و ضابطے

(۲) کتاب التعریفات (تعریفات فقہیہ و اصطلاحات شرعیہ)

(۳) احکام سحر و نظر مع مجرب عملیات اور مخصوص سورتوں کے

فضائل و خواص

(۴) تبلیغی چھ نمبر قرآن کی روشنی میں

(۵) دستور مملکت قرآن کی روشنی میں

(۶) احکام القرآن اردو (زیر ترتیب)

شامی اور بدائع الصنائع کے متعلق

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری کی رائے

فتویٰ لکھنے میں حضرت اکثر شامی ملاحظہ فرمایا کرتے مگر جس قول کے وہ ناقل ہوتے اس کو تو حضرت حجت سمجھتے اور جو صاحب شامی کی ذاتی رائے ہوتی اس کو حجت قرار نہ دیتے بلکہ تنقید و تحقیق کرتے اور فرمایا کرتے کہ معاصر ہیں ہم رجال و نحن رجال۔ ان کی رائے ہم پر حجت نہیں جب تک کہ اسلاف کے قول سے مؤید نہ ہو۔

اوقات فراغ میں حضرت بدائع کو اکثر دیکھا کرتے، بارہا سنا ہے کہ حضرت اس کے مصنف کو بہت دعائیں دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ واقعی یہ شخص فقیہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو فقہ ہی کے واسطے پیدا فرمایا تھا۔

مولوی ظفر احمد صاحبؒ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں فرمایا کہ مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتاء آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں اس سے کام نہیں چلتا اور جواب میں بہت غلطی ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں حالانکہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کے اندر تفصیل معلوم ہوتی ہے جس سے اس واقعہ مسئلہ کا حکم بدل جاتا ہے پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہئے۔

حضرت گنگوہیؒ نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے اس وقت تک بدائع مطبوع نہیں ہوئی تھی اب میں شامی کیساتھ اسکے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

حقیقت میں بدائع عجیب کتاب ہے، ایک بار فرمایا کہ جزئیات تو زیادہ شامی میں ہیں مگر اصول اور فقہ کی لم (علتیں) زیادہ بدائع میں کہ اس سے مناسبت ہو جائے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگے۔ (تذکرۃ الخلیل ص: ۲۹۴)